ماہنامہ

انذار

Inzaar

مدیر: ابویحییٰ

ستمبر ۲۰۲۲

www.inzaar.pk

September 2022

امید، اپنی اصلاح کا جذبہ اور تعمیری سوچ
یہ تین چیزیں اگر آپ کے پاس ہیں تو
دنیا و آخرت میں کامیابی سے آپ کو کوئی محروم نہیں کر سکتا

Please visit our websites to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

www.inzaar.pk (Urdu Website)

Join us on twitter @AbuYahya_inzaar

Join us on Facebook

Abu Yahya's Official Page: facebook.com/abuyahya.inzaar

Inzaar Official Page: facebook.com/inzaartheorg

Join us on YouTube youtube.com/inzaar-global

WhatsApp Broadcast list: Please contact +92-334-1211120 from WhatsApp (Daily Msg Service-Broadcast Lists – No Groups)

To get books and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Pakistan, contact 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit ww.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to **info@inzaar.org** and info@inzaar.pk

Our material in audio form is available on USB/CD

ماہنامہ
اِنذار
ستمبر 2022ء صفر 1444ھ
جلد 10 شمارہ 9

ابویحییٰ کے قلم سے

فی شمارہ ــــ 50 روپے
سالانہ (بذریعہ رجسٹری) صرف 1000 روپے
(زرتعاون بذریعہ منی آرڈر (VP) یا اکاؤنٹ)

P.O Box-7285, Karachi.
فون: 0332-3051201
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.pk

انسان اور کائنات

جیمز ویب دوربین کی کھینچی گئی ابتدائی تصاویر نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا ہے۔ کائنات کو پہلی دفعہ وقت میں اتنا پیچھے یعنی 13 ارب سال پہلے جا کر دیکھنا ممکن ہو گیا۔ آسان الفاظ میں اس بات کا مطلب یہ ہے کہ ہم جو روشنیاں دیکھ رہے ہیں وہ تیرہ ارب سال پہلے روانہ ہوئی تھیں جو ہم تک اب پہنچی ہیں۔ یوں یہ 13.8 ارب سال پہلے بننے والی کائنات کی ابتدا ہی میں وجود میں آنے والی کہکشاؤں کی تصاویر ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جو تصاویر ہم دیکھ رہے ہیں وہ کائنات کے ایک ذرے کا تعارف بھی نہیں کراتیں۔ خدا کی کائنات اتنی زیادہ وسیع ہے کہ نہ ہمارا تصور اس کو گرفت میں لے سکتا ہے نہ ہمارے پاس کوئی عام بول چال کا عدد ہے جو اس کی وسعتوں اور اس میں موجود ستاروں کی تعداد کو بیان کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اپنے بنانے والے کی عظمت کا ایسا غیر معمولی تعارف ہے کہ اس جیسا دوسرا تعارف ممکن نہیں۔

ان تصاویر نے سوچنے والے اذہان میں یہ سوال پھر تازہ کر دیا ہے کہ ہمارا اس عظیم کائنات میں کیا مقام ہے اور ہمارا اس سے کیا تعلق ہے۔ خوش قسمتی سے قرآن مجید جو اس کائنات کو بنانے والے خالق کا کلام ہے وہ اس سوال کا مکمل جواب ہمیں فراہم کرتا ہے۔ قرآن بیان کرتا ہے کہ رب العالمین نے نہ صرف یہ کائنات بلکہ اس جیسی چھ اور کائناتیں اپنے نیک بندوں کو انعام میں دینے کے لیے بنائی ہیں۔ سر دست یہ اسی طرح خام شکل میں ہیں جس طرح ہمارا سیارہ زمین آج سے ساڑھے چار ارب سال پہلے تھا۔ اور جس طرح اس عرصے میں زمین ایک آتشی گولے سے بدل کر جنت ارضی بن گئی ہے، اسی طرح باقی کائنات کے ساتھ بھی کیا جائے گا۔

ایک دن آئے گا جب زمین و آسمانوں کو بدل کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے گا۔ یہ وہ دن ہو گا

جب اول تا آخر انسان دوبارہ زندہ کیے جائیں گے۔ ہر ایک انسان کو خدا کے حضور پیش کیا جائے گا۔ وہاں ہر شخص اپنا تمام تر کارنامہ زندگی اس طرح دیکھے گا کہ رائی کے برابر نیکی یا برائی بھی چھپی نہ رہ سکے گی۔ جس شخص نے غیب میں رہتے ہوئے خالق کائنات کی عظمت کا اعتراف کیا اور اس کی بندگی کی راہ اختیار کی۔ اعلیٰ اخلاق کا نمونہ بنا اور عدل و احسان کی زندگی گزاری، آنے والی اُس دنیا میں ان ِگنت ستارے اور سیارے اس کی بادشاہی میں دے دیے جائیں گے۔اس کے برعکس جن لوگوں نے غفلت اور سرکشی کا رویہ اختیار کیا، انھیں کسی آتشی گولے میں جہنم رسید کر دیا جائے گا۔

بد قسمتی سے آج کے مسلمان نہ خود قرآن مجید کی اس دعوت کو مان کر زندگی اس کے مطابق بدلنے کے لیے تیار ہیں اور نہ دنیا کو کائنات کا یہ مقصد اور اپنا یہ انجام بتانے کے لیے تیار ہیں۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے گھر پیدا ہو گئے ہیں۔اس لیے خدا اس بات کا پابند ہے کہ ان کی تمام تر بداعمالیوں اور تعصّبات کے باوجود وہ جنت کو ان کے لیے لکھ دے۔

جو مسلمان نہیں ان میں سے بیشتر مشرک ہیں یا ملحد۔ وہ اس عظیم خالق کے ساتھ اپنے جیسی حقیر مخلوقات کو شریک ٹھہراتے ہیں یا خالق کی ہستی کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ کچھ سمجھتے ہیں کہ ان کے شریک انھیں خدا کی پکڑ سے بچالیں گے اور کچھ کہتے ہیں کہ نہ کوئی خدا ہے نہ کوئی آخرت ہو گی بلکہ یہ دنیا ایسے ہی چلتی رہے گی۔

یہ کائنات جس عظیم خالق کا تعارف کراتی ہے وہ ایسی ہر لایعنی بات سے پاک ہے۔ وہ خالق عدل کی بنیاد پر فیصلہ کرے گا اور لوگوں کو خالص میرٹ کی بنیاد پر ان کے اعمال کو دیکھتے ہوئے ان کے ابدی مستقبل کا فیصلہ کرے گا۔ نہ مسلمانوں کی خواہش سے کچھ ہو گا نہ معترضین اور منکرین کی ضد اور ہٹ دھرمی کچھ ان کے کام ہی آئے گی۔ کام صرف ایمان آئے گا یا حسن عمل۔ جس نے یہ کرنا ہے آج کر لے اور ان تصاویر میں اپنی جنت آج ہی دیکھ لے۔

اذان اور منفی سوچ

انسانی خامیوں کی فہرست اگر بنائی جائے تو منفی سوچ کو اس میں بلند ترین مقام حاصل ہوگا۔ اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ان میں سب سے اہم یہ ہے کہ منفی سوچ ایک متعدی مرض ہے ایک سے دوسرے کو لگتا ہے۔ مثلاً حالات خراب ہیں، کا جملہ جیسے ہی کسی محفل میں کسی کی زبان سے نکلے گا، تمام حاضرین محفل فوراً اس کے قائل ہوجائیں گے اور اس کی تائید میں شواہد اور دلائل فراہم کرنا شروع کر دیں گے۔

ایک اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ منفی سوچ ایک جھوٹی سوچ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس اصول پر بنائی ہے کہ یہاں ہر حال میں امکانات، مواقع، آسانیاں، خیر، نعمتیں اور ہر طرح کی مثبت چیزیں منفی چیزوں کی نسبت کہیں زیادہ موجود ہوتی ہیں، مگر منفی سوچ ان کو دیکھنے کے لیے انسان کو اندھا کر دیتی ہے۔ جس کے بعد آدمی مایوس ہوکر بیٹھ جاتا ہے اور غصے، جھنجھلاہٹ وغیرہ کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس کے برعکس مثبت سوچ ہمیشہ انسان کو بہتر نتائج تک لے کر جاتی ہے۔

اس کی ایک مثال اذان کی بلند آواز ہے جو بہت سے لوگوں کو ان کے کام کے دوران میں باعث زحمت محسوس ہوتی ہے جو ان کے کام پر سے ان کی توجہ ہٹا دیتی ہے۔ حالانکہ اذان کو خدا کی پکار سمجھ کر فوراً کام چھوڑ دیا جائے اور وضو وغیرہ کے لیے اٹھ جایا جائے تو اس سے انسان ایک ایسے روحانی تجربے سے گزرے گا جو اس کی روح اور دماغ دونوں کو پرسکون کر دے گا۔

یہ سکون انسان کی سب سے بڑی ضرورت ہے جو نہ صرف اس کی صحت اور خوشی کے لیے ضروری ہے بلکہ کام کو بہتر بنانے میں بھی مدد دیتا ہے۔ یہ ایک تجربے کی بات ہے جو ہر شخص آزما سکتا ہے۔ مگر انسان میں منفی سوچ ہو تو پھر انسان کو خدا پر بھی غصہ آنے لگتا ہے کہ اس نے اذان کا حکم شریعت میں کیوں مقرر کیا ہے۔ جبکہ مثبت سوچ کا انسان اس تجربے کو ایک روحانی تجربہ بنائے گا اور خدا کے قرب کے ساتھ کام میں مزید یکسوئی بھی حاصل کرے گا۔

ایمانیات میں اضافہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کو ہر دور میں اسی لیے بھیجا ہے کہ وہ لوگوں کو ان غیبی امور سے آگاہ کریں جن کو مان کر وہ عقیدے کی ہر گمراہی سے بچ کر زندگی گزار سکتے ہیں۔ اور اسی طرح ان کو وہ عبادات سکھائیں جن سے وہ اپنے رب کا قرب اور اس کی رضا حاصل کر سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے لوگ نہ انبیا کے بیان کردہ ایمانیات پر قانع ہوتے ہیں نہ عبادات پر۔

ان میں سے ایمانیات کا معاملہ اس پہلو سے بہت سنگین ہے کہ اول ان کو قرآن مجید نے خود موضوع بنالیا ہے۔ قرآن مجید نے جگہ جگہ ان ایمانیات کو تفصیل اور جزئیات میں جا کر بیان کیا ہے۔ بعض مقامات پر سب ایمانیات کو ایک جگہ جمع کر کے بیان بھی کر دیا ہے جن سے وہ بالکل متعین طور پر سامنے آجاتے ہیں۔ یہ ایمانیات تعداد میں پانچ ہیں: اللہ، آخرت، نبیوں، کتابوں اور فرشتوں پر ایمان کے عنوان سے قرآن مجید میں اور اسی طرح روایات میں بھی بیان ہوئے ہیں۔

مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا شاید ہی کوئی گروہ ہوگا جس کے ایمانیات کی فہرست پانچ پر ختم ہوتی ہو۔ ایمانیات میں ان اضافوں میں سے اکثر غلط فہمی سے ایمانیات کا حصہ بن گئے ہیں۔ جیسے خیر و شر پر ایمان کوئی چھٹا ایمان نہیں بلکہ توحید پر ایمان کا ایک جز ہے۔ اسی طرح آمد مہدی و مسیح کو عقیدہ بنالینا حضور کے اخبار کو ایمان میں بدلنے کی غلطی ہے۔ حضور کی نسبت سے مستقبل کا جو واقعہ بیان ہوگا، اس کی نسبت اور اس کا فہم اگر درست ہے تو وہ ضرور پورا ہوگا، مگر وہ ایمانیات میں شامل نہیں ہوسکتا۔

ایمانیات صرف وہی پانچ چیزیں ہی ہیں جن کو قرآن میں اس حیثیت میں بیان کر دیا گیا ہے اور ان پر ایمان لانے پر نجات کو موقوف قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور چیز پر ایمان لانے کا مطالبہ کرنا قرآن میں اضافہ کرنے کے مترادف ہے۔

طاقت کی خرابی کا حل

لارڈ ایکٹن ایک انگریز مورخ ہے۔اس کا ایک مقولہ بہت مشہور ہے۔

"Power tends to corrupt, and absolute power corrupts absolutely."

یعنی طاقت خرابی کا باعث ہوتی ہے اور مکمل طاقت مکمل بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ یہ کم وبیش وہی بات ہے جو قرآن مجید میں بیان ہوئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو یہ بتایا کہ وہ زمین میں ایک صاحب اقتدار ہستی پیدا کر رہے ہیں فرشتوں نے کہا کہ کیا آپ کسی ایسی ہستی کو زمین میں اقتدار دیں گے جو زمین میں فساد مچائے گی اور خونریزی کرے گی (البقرہ2:30)۔

اس دنیا میں سب سے زیادہ طاقت حکمرانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔اس لیے عام طور پر سب سے زیادہ خرابی کا ظہور بھی ان کے ہاں ہی ہوتا ہے۔ زمانہ قدیم میں جب حکومت بادشاہوں اور آمروں کی ہوتی تھی تو اس خرابی کا ظہور آخری درجہ میں ہوتا تھا۔دورِ جدید میں اس صورتحال کو قابو میں کرنے کے لیے دنیا بھر میں بہت سے اقدامات کیے گئے ہیں۔ان میں سے ایک یہ ہے کہ اب ہر چند سال بعد عوام کو اختیار ہوتا ہے کہ حکمران کو تبدیل کر دیں۔

اسی طرح کسی فرد بشمول حکمران ،کا قانون سے بلند نہ ہونا، پریس کی آزادی اور حکومتی اختیارات کی تقسیم بھی اس مسئلے کے حل کے طور پر پیش کیے جاتے ہیں۔تاہم انسان جب تک انسان ہے وہ ان تمام چیزوں سے بچنے کا کوئی نہ کوئی چور دروازہ ڈھونڈ لیتا ہے۔اسی لیے دنیا بھر میں حکمران اور طاقتور طبقات کے ظلم، ناانصافی کرپشن کی داستانیں سامنے آتی رہتی ہیں۔

اس مسئلے کا واحد حل اخلاقی تربیت ہے۔اس لیے کہ ایک اخلاقی تربیت یافتہ انسان خود اپنی نگرانی کرتا ہے۔ جو شخص اس کردار کا حامل ہو، دنیا بھر کی طاقت اسے بگاڑنے سے عاجز رہتی ہے۔

روحانی مدافعتی نظام

پچھلے دنوں ایک سینئیر ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی۔ دوران گفتگو انھوں نے یہ بتایا، اللہ تعالیٰ نے انسانی جسم کو ایسا غیر معمولی نظام عطا کیا ہے کہ انسان کا بیمار ہونا بہت مشکل ہوتا ہے سوائے اس کے کہ انسان اپنی بے احتیاطی اور غلطیوں کی وجہ سے خود کو کمزور کر لے۔ انھوں نے بتایا کہ جب بھی کوئی جرثومہ انسان پر حملہ کرتا ہے تو انسانی جسم مختلف طریقوں سے اس کو جسم سے پہلے مرحلے پر ہی نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً کھانسی اور چھینکیں ناک اور گلے کے ذریعے سے اندر داخل ہونے والے جراثیم کو باہر نکالنے کی کوشش کرتی ہیں۔ یوں انسان اکثر اوقات بیماری سے بچ جاتا ہے۔

جرثومہ اس کے باوجود اندر ہی رہ جائے تو انسانی نظام مدافعت پوری قوت کے ساتھ اس پر حملہ کرتا ہے اور اکثر و بیشتر موثر ہونے سے پہلے ہی اسے مار دیتا ہے۔ فطری حالات میں یہ مدافعتی نظام اتنا موثر ہوتا ہے کہ انسانوں کے بیمار ہونے کا امکان بہت کم ہوتا ہے۔ انسان اس وقت بیمار ہونا شروع ہوتے ہیں جب وہ فطرت سے دور ہوتے ہیں یا بعض نازک مواقع اور بعض غلطیوں کی بنا پر مدافعتی نظام کو خود ہی کمزور کر لیتے ہیں۔

مناسب نیند نہ لینا، بہت زیادہ تکان اور بے آرامی، دھوپ کا کم لینا جس کی وجہ سے وٹامن ڈی کی کمی ہو جاتی ہے، غیر متوازن غذا جس سے جسم میں وٹامن اور پروٹین جیسے اہم اجزا کی کمی ہو جاتی ہے، ٹینشن، غم والم اور اسٹریس لینا، منفی سوچ میں جینا جس میں انسان زندگی، حالات اور لوگوں کے صرف منفی رخ کو دیکھتا ہے؛ وہ اہم ترین وجوہات ہیں جو انسان کے مدافعتی نظام کو کمزور کر دیتی ہیں اور ایسے لوگ ہر بیماری کا سب سے پہلے نشانہ بنتے ہیں۔

اسی طرح شہری زندگی کی خرابیوں میں جینے والے، جیسے پالوشن کا شکار لوگ، گھروں کو

قالینوں پردوں سے آراستہ کرنے، کھانوں میں بازاری یا فرج کے رکھے ہوئے باسی کھانا کھانے والے لوگ بھی بیماریوں کو خود دعوت دیتے ہیں۔

اس کے برعکس جو لوگ ان معاملات میں درست جگہ کھڑے ہوتے ہیں، وہ بہت کم بیمار ہوتے ہیں اور کبھی ہو بھی جائیں تو نہ بیماری شدید ہوتی ہے اور نہ شفایابی میں زیادہ وقت لیتے ہیں۔ ایسے لوگ جلد ہی تندرست ہو کر دوبارہ معمولاتِ زندگی پر بحال ہو جاتے ہیں۔

انسان کے جسمانی وجود کی طرح انسان کا روحانی وجود بھی مختلف امراض کا شکار ہو سکتا ہے۔ جسمانی مدافعتی نظام کی طرح ان روحانی امراض کے خلاف بھی اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک بہت مضبوط مدافعتی نظام دے رکھا ہے جس کے کئی اجزا ہیں۔ اس کا پہلا جز فطرت ہے جو انسان کو برے اور بھلے کا شعور دیتی ہے اور اس میں انسان اس طرح واضح کہ جس طرح وہ خوشبو اور بدبو میں بغیر کسی کے بتائے فرق کر سکتا ہے، اسی طرح وہ برائی اور بھلائی میں امتیاز کر سکتا ہے۔ اس کا دوسرا جز ضمیر ہے۔ یہ ضمیر انسان کو برائی کے ارتکاب پر جھنجھوڑتا اور بھلائی پر تسکین وطمانیت دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔

یہ دونوں چیزیں فطرت سے اٹھتی ہیں جن کے بعد انسان کا وہ ایمان ہے جو شعوری ہوتا ہے۔ یہ ایمان انسان کو بتاتا ہے کہ انسان کا ایک خالق و مالک ہے جو اس کے لمحہ لمحہ پر نگران اور ہر عمل کا گواہ ہے اور ایک روز انسان کو اس کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا جواب دینا ہے۔ اس ایمان سے جنم لینے والی تقوی کی نفسیات اس مدافعتی نظام کا تیسرا بنیادی جز ہے۔

جو لوگ اس روحانی مدافعتی نظام کو خواہش، تعصب، غفلت اور مفاد پرستی سے کمزور نہیں کرتے وہ ایمان واخلاق کی بیماریوں سے دور رہتے ہیں اور کبھی مبتلا ہو جائیں تو توبہ کی دوا سے فوراً شفا پا جاتے ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اس نظام کو مذکورہ بالا چیزوں سے کمزور کرتے ہیں، وہی ہر طرح کی روحانی بیماریوں کا مستقل نشانہ بنے رہتے ہیں۔

وفاداری

دنیا بھر میں لکھی یا سنائی جانے والی داستانوں اور کہانیوں میں محبت اور وفا بنیادی موضوع ہوتے ہیں۔ان داستانوں میں اکثر ہیرو ہیروئن کی وفا یا بے وفائی کو موضوع بنایا جاتا ہے۔بعض اوقات وفا کی ان داستانوں میں لوگ جان دے کر اپنی محبت اور وفاداری کو ثابت کرتے ہیں۔

تاہم وفا ان داستانوں میں جتنی عام ہے، اتنی ہی عملی زندگی میں نایاب ہے۔عملی دنیا میں اپنا مفاد، اپنی خواہش، اپنا تحفظ لوگ سب سے پہلے رکھتے ہیں۔اس کے بعد ممکن ہے کہ کچھ نہ کچھ وہ دوسروں کے لیے کر دیں۔ یہ رویہ قطعاً فطری اور نارمل ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک کمزور مخلوق ہے۔اگر وہ خود اپنے آپ کو پہلے نہیں دیکھے گا تو اس کا جینا ہی ممکن نہیں رہے گا۔اس لیے فلموں اور کہانیوں سے قطع نظر حقیقت کی دنیا میں وفا نہیں بلکہ مفاد اہم ہوتا ہے۔اس کے بعد کوئی حسب استطاعت وفا کر لے تو بڑی بات ہے۔

تاہم اس معاملے میں ایک استثنا ہے۔وہ اللہ تعالیٰ کی ہستی کا ہے۔اللہ تعالیٰ کا وصف قرآن میں البَـر بیان ہوا ہے۔البَـر سے مراد وہ ہستی ہے جو اپنے قول و قرار کو نبھانے والا ہو۔اس کے ساتھ وہ وعدے سے بڑھ کر اپنی بات پوری کرے، جو طے نہیں ہوا تھا وہ بھی دے۔جس کی افضال وعنایات لامحدود ہوں۔

سورہ الطّور میں اس بات کو جنت کی اعلیٰ ترین نعمتوں اور خدا کے خصوصی اور لامحدود احسان، افضال اور عنایات کو بیان کرنے کے بعد اہل جنت کی زبانی اس طرح بیان کیا گیا۔

اس میں شبہ نہیں کہ وہ البَر الرحیم ہے۔(الطّور 52: 28)

بندۂ مومن اس دنیا میں خدا سے وفاداری کے عوض یہ توقع رکھتا ہے کہ اس سے کیے گئے وعدے نبھائے جائیں گے۔اب اصول تو یہ ہونا چاہیے کہ خدا نے جنت میں ابدی زندگی کا وعدہ

کیا ہے تو وہ انسان کو جنت ہی دے۔ یہ جنت اپنے نام سے ظاہر ہے کہ باغات کا نام ہے۔ خدا اگر انسان کو ابدی طور پر باغوں میں بسا دے تو اس کا وعدہ پورا ہو جائے گا۔ مگر اللہ تعالیٰ ایسا نہیں کریں گے۔ اول تو جنت کے جو باغ دیے جائیں گے ان کا دنیا کے باغات سے کوئی موازنہ نہیں ہوسکتا۔ دوسرے جنت صرف باغات تک محدود نہیں ہوگی بلکہ قرآن نے اس میں آخری بات یہ کہہ دی ہے کہ وہاں جو تمھارا دل چاہے اور جو تم مانگو گے تمھیں دیا جائے گا، (حم السجدہ 41:31)۔ یہ آخری چیز ہے جس کا انسان تصور کرسکتا ہے اور یہ چیز بھی انسان کو دے دی جائے گی۔

تاہم خدا کی ہستی چونکہ انسانوں کے تصورات سے بھی بلند ہے، اس لیے اس کی عطا اس سے بھی کہیں زیادہ ہوگی۔ قرآن میں دو مقامات پر یہ بات بیان کی گئی ہے کہ انسانوں کے لیے ان کے رب نے جو جنت تیار کی ہے اس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔ موجودہ سائنسی دور میں ہم یہ جانتے ہیں کہ صرف ہماری یہ کائنات اتنی وسیع ہے کہ اس میں اربوں کہکشائیں ہیں اور ہر کہکشاں میں اربوں ستارے ہیں۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کائنات جیسی چھ اور کائناتیں اللہ تعالیٰ نے بنائی ہیں۔ یہ سب کی سب جنت میں تبدیل کر کے انسانوں کو دے دی جائیں گی۔ چنانچہ اس جنت کی وسعت کا، وہاں موجود نعمتوں کا، وہاں پائی جانے والی زندگی کی نوعیت کا کوئی ادنیٰ سا اندازہ بھی اس دنیا میں ہم نہیں کر سکتے۔

تاہم اس جنت کی ایک قیمت ہے۔ وہ قیمت یہ ہے کہ اپنے حصے کی وفا ہمیں نبھانی ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے کوئی ایسا مطالبہ نہیں کیا جو ہم پورا نہ کرسکیں۔ مگر بدقسمتی سے ہم پیدائشی مسلمان ایمان جیسے بنیادی مطالبے کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ ہم اپنے پیدائشی معتقدات اور خاص فرقے کے تصورات کو ایمان سمجھتے ہیں۔ جبکہ ایمان صرف اسی ایمان کا نام ہے جو قرآن مجید

کے عین مطابق ہو۔

قرآن مجید کے ایمانیات پانچ ہیں۔یعنی اللہ پر ایمان، آخرت پر ایمان، رسولوں پر ایمان، کتابوں پر ایمان اور فرشتوں پر ایمان۔قرآن مجید کی جس آیت میں یہ البر یا وفاداری کا وصف انسانوں سے منسوب کیا گیا ہے وہاں ایمانیات ایسے بیان کیے گئے ہیں۔

اللہ کے ساتھ وفاداری (البر) صرف یہ نہیں کہ تم نے (نماز میں) اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف کرلیا، بلکہ وفاداری تو ان کی وفاداری ہے جو پورے دل سے اللہ کو مانیں اور قیامت کے دن کو مانیں اور اللہ کے فرشتوں کو مانیں اوراس کی کتابوں کو مانیں اوراس کے نبیوں کو مانیں۔(البقرہ2 :177)

مسلمانوں کا کون سا فرقہ ہے جس کے ایمانیات ان پانچ چیزوں کے ساتھ ختم ہوجاتے ہیں؟ خیال رہے کہ ایمانیات اوراسی طرح عبادات میں اجتہاد کرکے اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ جرم ہے۔ یہ فرقہ واریت کا سبب ہے۔اس لیے کہ ہرفرقہ دوسرے فرقہ سے جدا ہی تب ہوتا ہے جب اس کے ایمانیات دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

قرآن اصرار کرتا ہے کہ ہماری شناخت ایک ہی ہے اور وہ ہے مسلمان۔سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کا کون سا مذہبی گروہ اس شناخت پر رکا ہوا ہے۔ ہرگروہ کی ایک اضافی شناخت ہے۔ جواسے دوسرے گروہ سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ ایمانیات میں ہمارا حال ہے جوقرآن مجید کا موضوع ہےاور ہر خاص وعام قرآن کھول کراسے پڑھ سکتا ہے۔اس کے بعد اعمال کا معاملہ کیا زیر بحث لایا جائے۔

تاہم جس شخص کے لیے آخرت ایک سنجیدہ معاملہ ہے اوروہ چاہتا ہے کہ خدا قیامت کے دن البَر کی حیثیت میں اس سے اپنے وعدے نبھائے، اس پر لازم ہے کہ وہ پہلے خود برّ و وفاداری کے تقاضے اِس دنیا میں نبھائے۔اس کے بغیر وہاں اسے کچھ نہیں ملنے والا۔

اخلاقی دیوالیہ پن اور بہتری کا راستہ

پنجاب اسمبلی کے وزیر اعلیٰ کے انتخاب کے موقع پر جو کچھ ہوا ہے، اس کے بارے میں پوری قوم یہ بات سمجھتی ہے کہ اس کا اخلاقیات، دیانت اور اصولوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تاہم اس چیز کو صرف سیاستدانوں کے ساتھ نتھی کر دینا درست نہیں ہے۔ اس وقت مختلف اینکروں، کالم نگاروں، فیس بک لکھاریوں کو پڑھ لیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان میں سے غالب ترین اکثریت کا مسئلہ اخلاقی نہیں بلکہ یہ ہے کہ وہ جس پارٹی کا حامی ہے اس کے حق میں فضا کیسے ہموار کرنی ہے۔

اگر وہ پی ٹی آئی کا حامی ہے تو اب اسے سارے اصول و اخلاقیات یاد آ چکے ہیں۔ آئین کی شقیں زیر بحث آ رہی ہیں۔ قانونی نکات اٹھائے جا رہے ہیں۔ دیانت اور اخلاقیات کی موت پر ماتم ہو رہا ہے۔ کچھ عرصے پہلے تک یہی وہ لوگ تھے جو اسی نوعیت کی چیزوں کا دفاع مختلف حیلے بہانوں سے کرتے، خوشی سے بغلیں بجاتے یا پھر خاموشی اختیار کیے رہتے تھے۔

اگر معاملہ پی ڈی ایم کے حامیوں کا ہو تو ان کی زبان سے مذمت کے الفاظ نکلنے مشکل ہو رہے ہیں۔ جشن منایا جا رہا ہے اور جیسے کو تیسے کے اصول یا کچھ قانونی موشگافی کے ذریعے وزیر اعلیٰ کے انتخاب کو جائز قرار دیا جا رہا ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جو کچھ عرصے پہلے تک پی ٹی آئی کے غیر اخلاقی اور غیر قانونی اقدامات کی مذمت میں پیش پیش رہتے تھے۔ باقی جو لوگ غیر سیاسی ہیں وہ پہلے ہی اپنے حلف کو کھیل بنا کر اس ملک کو تباہی کے دہانے پر لے آئے ہیں۔

پاکستان کے حالات میں بہتری کی ایک ہی امید ہے کہ اس قوم کا مردہ اخلاقی شعور زندہ کیا جائے۔ کرنے کا کام یہی ہے۔ اس کے علاوہ ہر دوسرا کام کوئی مستقل تبدیلی اور پائیدار بہتری

نہیں لاسکتا۔

اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی بالکل واضح ہوگئی ہے کہ ہمارا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ فلاں سیاست دان حکومت میں ہو تو معاملات ٹھیک ہوں گے اور فلاں نہ ہو تو ٹھیک ہوں گے۔

ہمارے نزدیک اس ملک کی خرابی کے اصل ذمہ دار سیاستدان نہیں، بلکہ وہ عہدیدار ہیں جنھوں نے کسی بھی سرکاری حیثیت میں حلف اٹھا رکھا ہے۔ یہ حلف صدر، وزیراعظم اور وزرائے اعلیٰ کے عہدوں پر پہنچنے والے چند سیاستدان بھی اٹھاتے ہیں لیکن باقی سیاستدان کوئی حلف نہیں اٹھاتے۔اس کے برعکس مختلف اداروں میں حلف اٹھا کر اہم جگہوں پر تعینات ہونے والے غیر سیاسی لوگوں کی تعداد اور حالات کی خرابی میں ان کی ذمہ داری کہیں زیادہ ہے۔

جو عہدیدار یہ حلف اٹھاتے ہیں، وہ اپنے سر دوہری ذمہ داری لیتے ہیں۔ وہ عام اخلاقی پابندیاں جو ہر انسان اور مسلمان پر عائد ہوتی ہیں، ان پر وہ بھی عائد ہوتی ہیں اور دوسری اضافی ذمہ داری وہ اپنے عہدے کا حلف اٹھا کر اپنے اوپر عائد کرتے ہیں۔اس کے بعد جو شخص عہدے کا حلف اٹھا کر، قسم کھا کر اور خدا کو گواہ بنا کر غیر اخلاقی، غیر آئینی اور غیر قانونی کام کرتا ہے وہ ایک سیاستدان کے مقابلے میں دوگنا مجرم ہے۔

تاریخ کے آئینے میں پاکستان کے حالات پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ سیاستدانوں نے اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ملک بنایا، ملک بچایا اور ملک چلایا۔ دوسری طرف ہماری ہر خرابی بشمول موجودہ حالات کی خرابی حلف اٹھانے والوں کے غلط اقدامات کا نتیجہ ہے۔ جب تک اس حقیقت کو نہیں مانا جائے گا، اس ملک میں سسٹم کی سطح پر کوئی بہتری نہیں آئے گی۔

سوال و جواب

ابو یحییٰ

اچھے حکمران کیسے ملیں گے؟

سوال

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ ایک سوال ہے جس کا میں آپ سے جواب چاہتی ہوں۔ موجودہ ملکی سیاسی صورتحال آپ کے سامنے ہے۔ مجھے یہ جاننا ہے کہ مجھ سمیت پوری قوم کو اپنے اندر وہ کیا خصوصیات یا تبدیلیاں پیدا کرنے کی ضرورت ہے اور کون سی برائیوں کو دور کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ جس کے بعد اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے نیک بندے حکمرانی کے لیے عطا کردے یا انھی لوگوں کو ہدایت دے دے کہ وہ ملک کے لیے صحیح طور پہ کام کریں؟

امامہ رضوان

جواب

محترمہ امامہ رضوان صاحبہ!

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ۔

عزیز بہن! موجودہ دور جمہوری دور ہے۔ اس میں حکمرانوں کا انتخاب عوام کرتے ہیں۔ یہ عوام کی ذمہ داری ہے کہ وہ جب کسی جماعت کے امیدوار کو ووٹ ڈالے تو ایسا کسی تعصب یا ذاتی مفاد کی بنیاد پر نہ کریں بلکہ یہ دیکھیں کہ کون لوگ ہیں جن کے قول و فعل میں تضاد نہیں۔ اس بات کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ہر پارٹی عوام کے پاس جاتی ہے تو اچھے وعدے ہی کرتی ہے، مگر اقتدار میں آ کر وہ اپنے وعدے بھلا دیتی ہے۔ یہ قول و فعل کا وہ تضاد ہے جو ہمارے تمام مسائل کی جڑ ہے۔ مختلف معاملات پر تمام جماعتوں کے موقف علانیہ ہیں۔ ان سے جانا جا سکتا ہے کہ وہ لوگ کسی معاملے میں کیا پالیسی رکھتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان میں موجود کم و بیش تمام سیاسی پارٹیاں کبھی نہ کبھی قومی یا صوبائی سطح پر حکومت میں رہی ہیں۔ چنانچہ ان کے ماضی کے ریکارڈ کو دیکھ کر باآسانی بتایا جا سکتا ہے کہ کون سی پارٹی اپنے وعدوں کے خلاف کرتی رہی

ہے۔اس معاملے میں مسئلہ یہ پیش آسکتا ہے کہ ہر پارٹی کے حامی عام طور پر مبالغہ کر کے، جھوٹ بول کر اپنی کارکردگی کو زیادہ بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے جھوٹ اور مبالغے کو جاننے کے لیے ان کے مخالفین کے الزامات کو سنیں۔آپ پر واضح ہو جائے گا کہ کون درست ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔لوگ جب کسی پارٹی کے حامی یا مخالف ہوتے ہیں تو وہ تعصب میں اندھے ہو جاتے ہیں۔ وہ صرف اپنے لیڈر کے حق میں باتیں سنتے، کالم پڑھتے، تجزیے اور چینل دیکھتے ہیں۔ جہاں ان کے خلاف بات ہوتی ہے فوراً کان بند کر لیتے ہیں۔ ہمارے موجودہ حالات ہمارے اسی اندھے تعصب کا نتیجہ ہیں۔چنانچہ ہم سب کو اپنا تعصب چھوڑ کر توبہ کرنی چاہیے۔تعصب چاہے مذہبی ہو یا سیاسی ،انسان کو اندھا کر دیتا ہے جس کے بعد انسان حق کو دیکھنے سے محروم ہو جاتا ہے۔ ہمارا دوسرا بڑا جرم یہ ہے کہ ہمارے اندر بدترین اخلاقی کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ ہم جھوٹ بولتے ہیں اور اطمینان سے جھوٹ اور سنی سنائی بات آگے پھیلاتے ہیں۔خاص کر معاملہ تعصب کا ہو تو جھوٹ ،الزام، بہتان تو اتنی آسانی سے ہماری زبان سے نکلتا ہے کہ گویا ہمیں خدا کے حضور اپنے اعمال کا جواب نہیں دینا۔اسی طرح اپنی ذاتی زندگی میں دوسروں کی حق تلفی، بے انصافی، مفاد پرستی ہمارا معمول ہے۔ جب ہم سب اپنی اپنی زندگی میں اور اپنے اپنے دائرے میں ظالم اور بدکار ہیں تو ہمارے حکمران کیسے نیک اور صالح لوگ ہو سکتے ہیں؟ ہم معمولی سا اختیار پا کر بے قابو ہو جاتے ہیں تو وہ آخری درجہ کا اقتدار پا کر کیسے قابو میں رہ سکتے ہیں۔ اس لیے ہم سب کو اپنی اپنی جگہ اپنے رویے کی اصلاح کرنی ضروری ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری ایلیٹ کلاس اور مقتدر طبقات جس میں ہر طاقتور طبقہ شامل ہے بدترین اخلاقی بحران کا شکار ہیں اور ان کی اصلاح کے بغیر ملک کے حالات بہتر نہیں ہو سکتے لیکن ان کی اصلاح سے پہلے عوام الناس کی سطح پر یہ احساس پیدا ہونا ضروری ہے کہ ہمیں اپنی اصلاح کی ضرورت ہے۔اس کے بجائے ہمارے ہاں ان کی نفرت پیدا کی جاتی ہے یا کسی ایک گروہ کی وفاداری میں دوسروں کے خلاف نفرت پھیلائی جاتی ہے۔اس سے اصلاح کے بجائے معاملات اور خراب ہوتے ہیں۔اس سلسلے کو بند ہونا چاہیے۔اس سلسلے کی سب سے

اہم بات یہ ہے کہ ہم دنیا میں اسلام کے نام پر کھڑے ہیں۔ اور دوسری طرف ہم اپنے رویے سے دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ بدترین اخلاقی رویہ اور اندھا سیاسی اور مذہبی تعصب کیا ہوتا ہے جو انسان میں حق کو دیکھنے اور اسے اپنانے کی صلاحیت ختم کر دیتا ہے۔ اس منافقت کی سزا اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ ایسی قوم کو دنیا کے سامنے عبرت بنا کر اللہ تعالیٰ لوگوں کو یہ بتائیں کہ وہ اپنے مجرموں کے ساتھ کیا کرتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ ہماری پوری قوم ہی ایسی نہیں ہے۔ جب یہ بات کہی جاتی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بہت سے لوگ یہ سب کچھ کر رہے ہیں اور بیشتر خاموشی سے یہ دیکھ رہے ہیں اور اس سیاسی اور مذہبی تعصب اور اخلاقی پستی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں نہ مورچا لگاتے ہیں۔ ایسے لوگ بھی شریک جرم ہوتے ہیں۔ اس کے بعد چند گنے چنے لوگ ہی رہ جاتے ہیں جو ذاتی زندگی میں بھی بہتر ہوتے ہیں اور ان رذائل کے خلاف بھرپور آواز بھی اٹھاتے ہیں۔ سر دست ایسے لوگ گنتی کی تعداد میں ہیں۔ جیسے جیسے ان لوگوں کی تعداد بڑھے گی صورتحال بہتر ہوگی۔ مجھے اور آپ کو انھی لوگوں میں خود کو شامل کرنا ہے جو خود بھی ہر طرح کے تعصب سے اوپر اٹھ کر بہترین اخلاقی رویے کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان جرائم کے خلاف آواز بھی اٹھاتے ہیں۔ ہمارے لیے یہی لائحہ عمل ہے اور یہی راستہ ہے۔ جب ہم یہ کریں گے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ہماری طرف متوجہ ہوگی۔ جس کے بعد ہمارے ملک کے حالات بہتر ہونا شروع ہوں گے۔ چنانچہ مجھے اور آپ کو آج ہی توبہ کرنی ہے کہ ہم اپنی ذاتی زندگی میں ہر ظلم، ناانصافی اور بددیانتی سے بچیں گے۔ ہر طرح کے مذہبی اور سیاسی تعصب کو چھوڑ دیں گے اور ان چیزوں کے خلاف بھرپور آواز اٹھائیں گے۔ آیئے قوم کا ماتم چھوڑ کر یہ کام کرتے ہیں۔ ہم یہ کریں گے تو ان شاء اللہ ہمارے حالات بہتر ہو جائیں گے۔ ورنہ لوگ کچھ بھی کر لیں ہمارے حالات بہتر ہونے والے نہیں ہیں۔

بندہ عاجز

ابو یحییٰ

ابو یحییٰ

خدا اور ارتقا

برٹنڈ رسل (1872-1970) دور جدید کا وہ مفکر اور فلسفی ہے جس نے مغربی فکر اور اقدار کو بہت زیادہ متاثر کیا ہے۔ مثال کے طور پر آج کے مغرب میں ایک غیر شادی شدہ خاتون کے لیے عفت وعصمت کوئی قابل لحاظ چیز نہیں ہے۔ مگر مغرب ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ انیسویں صدی کی وکٹورین اقدار کے تحت مغرب ایک عفت پسند معاشرہ تھا۔ مگر بیسویں صدی میں یہ برٹنڈ رسل ہی تھا جس نے اپنی مشہور کتاب Marriage and Morals میں اس تصور عفت کو دور جدید میں نا قابل عمل قرار دیا تھا۔ شروع میں اس کی سخت مخالفت ہوئی لیکن رفتہ رفتہ اس کی بات کو قبول کرلیا گیا اور بعد میں اس کتاب کی بنیاد پر اسے نوبل پرائز بھی ملا۔

اس نقطہ نظر کی قبولیت کی اساس یہ حقیقت تھی کہ صنعتی انقلاب کے بعد نوجوان تعلیم، ملازمت اور پھر صنعتی دور کی ایجادات کے بعد وجود میں آنے والے ایک خاص معیار زندگی تک پہنچتے پہنچتے تیس برس کی عمر کو پہنچ جاتے تھے۔ رسل کے سامنے سوال یہ تھا کہ شادی اگر اس عمر میں ہوگی تو اس انسانی ضرورت کا کیا ہوگا جو بلوغت کے فوراً بعد پوری شدت سے پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس کا حل یہ تھا کہ انسانی ضرورت کو شادی سے الگ کر دیا جائے۔ یوں ایک نوجوان خاتون یا مرد شادی تو تیس برس کی عمر کے لگ بھگ زندگی میں سیٹ ہونے کے بعد ہی کرے، لیکن اپنی انسانی ضرورت کو شادی کے بغیر ہی پورا کرتا رہے۔ اس کا لازمی نتیجہ تصور عفت کا خاتمہ تھا۔

رسل کے اس حل نے بیسویں صدی کے مغرب میں ایک مسئلہ حل کیا لیکن کئی اور مسائل پیدا کر دیے۔ اس کی تفصیل ہماری اس تحریر کا موضوع نہیں ہے۔ لیکن سر دست ہم صرف یہ توجہ دلانا

چاہتے ہیں کہ آج ہم ٹھیک اسی جگہ کھڑے ہوئے ہیں جس جگہ ایک صدی قبل مغرب کھڑا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہم رسل کا بیان کردہ حل نہیں قبول کر سکتے۔ مگر بدقسمتی سے معاشرہ اتنے سنگین انسانی مسئلے کو حل کرنے کے لیے بالکل بے حس بنا ہوا ہے۔ جس کے نتیجے میں منافقت، جنسی انارکی اور بے راہ روی بڑھ رہی ہے۔ اس مسئلے کا ہمارے معاشرے اور ہماری مذہبی اقدار کے تحت کیا حل ہے، اس پر ہم نے پہلے بھی قلم اٹھایا تھا اور ان شاءاللہ آئندہ بھی لکھتے رہیں گے۔ مگر یہ ایک الگ موضوع ہے۔ سردست جو بات اس مثال سے واضح کرنی مقصود تھی وہ یہ کہ برٹنڈ رسل کا فکری طور پر مغرب میں کتنا اثر تھا اور آج تک ہے۔

رسل کا حوالہ آج جس پہلو سے دینا مقصود ہے وہ اس کا ایک دوسرا مضمون Why I Am Not a Christian ہے جو دراصل رسل کا ایک لیکچر ہے جو 1927 میں دیا گیا تھا۔ اس میں رسل نے وجود باری تعالیٰ کے حوالے سے دی جانے والی مختلف دلیلوں کو رد کیا ہے۔ یہ مضمون جو بہت مشہور ہوا بعد میں اسی موضوع سے متعلق بہت سے دیگر مضامین کے ساتھ ایک مجموعے کی شکل میں Why I Am Not a Christian کے عنوان ہی سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کے مقدمے میں رسل نے مذہب اور وجود باری تعالیٰ کی نفی کرتے ہوئے ایک بڑی دلچسپ بات لکھی ہے۔ وہ اسی کے الفاظ میں درج ذیل ہے۔

"There is one of these arguments which is not purely logical. I mean the argument from design. This argument, however, was destroyed by Darwin"

رسل کا مطلب یہ ہے کہ خدا کے وجود کے حق میں پیش کیے جانے والے تمام دلائل ارسطو کی پیش کردہ قدیم یونانی منطق پر مبنی تھے جو ویسے ہی رد ہو چکی ہے۔ وہ ان دلائل میں واحد استثنا دنیا

میں پائے جانے والے نظم کی بنیاد پر ایک ناظم یا خدا کے وجود کی دلیل کو سمجھتا ہے۔تا ہم اس کے نزدیک یہ دلیل بھی ڈارون کے نظریہ ارتقا نے ختم کر دی ہے۔ کیونکہ ارتقا کے نظریے نے یہ بتا دیا ہے کہ دنیا میں زندگی اور اس میں اتنا تنوع کیسے وجود میں آیا۔اس کے لیے کسی خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔

تاہم یہ بات سمجھ لینا چاہیے کہ برٹنڈ رسل کا مسئلہ خدا نہیں بلکہ مذہب ہے۔اس نے اسی کتاب کے مقدمے میں خود واضح کیا ہے کہ وہ مذہب کو غلط ہی نہیں سمجھتا بلکہ اس کے ساتھ وہ اسے نقصان دہ بھی سمجھتا ہے۔

I am as firmly convinced that the religions do harm as I am that they are untrue.

یہ صرف برٹنڈ رسل کا معاملہ نہیں، الحاد کے بیشتر پیروکار مذہب کے بارے میں ایسی ہی یا اس سے ملتی جلتی کوئی اور منفی رائے رکھتے ہیں۔ مذہب کے بارے میں اس رائے کی دو وجوہات برٹنڈ رسل اور دیگر ملحدین بیان کرتے ہیں۔ایک یہ کہ اہل مذہب اپنے عقائد اور تصورات کے سامنے کسی ثابت شدہ سچائی کو مانتے ہیں اور نہ اس کے خلاف کوئی عقلی استدلال قبول کرتے ہیں۔ جبکہ اہل مذہب کی دوسری روش یہ ہے کہ وہ تنقید کرنے والوں اور علم و عقل کی بات کرنے والوں کے دشمن بن کر کبھی انھیں قتل کر دیتے ہیں، کبھی جیل اور نظر بندی کا نشانہ بناتے ہیں، کبھی ان کی کتابیں جلاتے ہیں اور کبھی تشدد سے کام لے کر ان کا راستہ روکتے ہیں۔اسی طرح اہل مذہب دوسرے مذاہب کے حوالے سے بھی عدم رواداری کا شکار ہوتے ہیں اور ان کو شکست دینے، مٹا دینے اور ان پر اپنا غلبہ قائم کرنے کے درپے رہتے ہیں۔

یہ وہ دو چیزیں ہیں جن کی بنا پر ملحدین مذہب کو ناحق اور نقصان دہ سمجھتے ہیں۔اور ظاہر ہے کہ

مذہب کا تصور ہی خدا سے آتا ہے اس لیے مذہب کا انکار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ خدا کا انکار کیا جائے۔

اسلام کا جواب

ملحدین کا نقطہ نظر سامنے آنے کے بعد اب ضروری ہے کہ اس نقطہ نظر کا جائزہ لے کر دیکھا جائے کہ یہ کس درجہ میں معقولیت اور حقیقت پر مبنی ہے۔ اس حوالے سے پہلی بات ارتقا کا وہ نقطہ نظر ہے جس کے متعلق ملحدین کا خیال ہے کہ اس نے خدا کے تصور کی ضرورت کو ختم کر دیا ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے کہ خدا کے وجود پر شاہد کائنات کا یہ نظم جو زبان حال سے اپنے خالق کا تعارف ہے، بقول برٹنڈ رسل ڈارون اور اس کے نظریہ ارتقا نے اس دلیل کو ختم کر دیا ہے۔ اسی بنا پر ڈارون کے متعلق ملحدین یہ کہتے ہیں کہ اس نے معاذ اللہ خدا کو قتل کر دیا۔

اس نقطہ نظر کا جائزہ قرآن مجید کی روشنی میں لینے سے قبل یہ بتانا ضروی ہے کہ جس خدا کو قتل کرنے کا دعویٰ کیا جاتا ہے وہ مسیحیوں کا وہ خدا تھا جس نے زمین کو 4004 قبل مسیح 22 اکتوبر کی شام بنایا تھا۔ جس نے صبح و شام کے وقفے میں ایک ہی دن میں ساری مخلوقات کو پیدا کر دیا تھا۔ اور جس نے ہفتے کے چھ دنوں میں پوری کائنات بنا دی اور ساتویں دن آرام کیا۔ ظاہر ہے کہ مذہب اور خدا کے نام پر جب ایسے دعوے کیے جائیں گے تو پھر وہی ہونا بھی ہے جو پیچھے بیان ہوا ہے۔

تاہم نزول قرآن کے بعد اب خدا کی بات جاننے کا واحد قابل اعتماد ذریعہ قرآن مجید ہے۔ چنانچہ جب ہم قرآن مجید کو دیکھتے ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن مجید بھی تخلیق کائنات، انسان اور دیگر مخلوقات کی تخلیق اور انفس و آفاق کے آثار پر بار بار گفتگو کر رہا ہے، مگر مجال ہے کہ قرآن میں ایک لفظ بھی ایسا پایا جائے جسے سائنس کی کسی بھی ترقی نے غلط ثابت کر دیا ہو۔

اس کے بالکل برعکس محسوس ہوتا ہے کہ قرآن مجید اپنے ابدی اسلوب میں گویا انھی سوالات کا جواب دے رہا ہے جو آج کے انسان کے ذہن میں الحادی فکر نے پیدا کر دیے ہیں۔ قرآن مجید کائنات میں ہر سو پھیلی قدرت، ربوبیت اور حکمت کی نشانیوں کو بنیاد بنا کر ایک واضح سچائی کو لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ وہ یہ کہ یہ کائنات جو ہر پہلو سے مجموعہ اضداد ہے اور مختلف عناصر سے مل کر بنی ہے اور جس کی تمام طاقتیں زندگی کے لیے موت کا پیغام لاتی ہیں، اچانک اس کرہ ارض کے لیے ایک بالکل جدا روپ اختیار کر لیتی ہے۔ یہاں ہر کائناتی قوت اور عنصر زندگی کے فروغ اور اس کی بقا کی خدمت پر مامور ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ رب العالمین کی ہستی نے کیا ہے۔

یہی وہ بات ہے جس کے متعلق برٹنڈ رسل کا دعویٰ ہے کہ اسے ارتقا نے باطل کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیسے باطل کیا ہے؟ برٹنڈ رسل نے اپنے استدلال کی تفصیل Why I am not a christian میں اس طرح کی ہے۔

It is not that their environment was made to be suitable to them, but that they grew to be suitable to it, and that is the basis of adaptation. There is no evidence of design about it.

اس کا مدعا یہ ہے کہ حیات کے لیے موزوں ماحول کا مطلب یہ نہیں کہ کسی خدا نے زندگی کو پیدا کرنے کے لیے اس زمین پر زندگی کے لیے سازگار ماحول کو پیدا کیا۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اس ماحول کی وجہ سے زندگی نے جنم لیا اور پھر وہ زمین پر ہر جگہ اس ماحول کے لحاظ سے مختلف شکلوں میں ڈھلتی چلی گئی۔ اس لیے نظم کائنات یا ڈیزائن کی بنیاد پر خدا کے ہونے کی بات کرنا

کوئی ثبوت نہیں۔

برٹنڈرسل کے استدلال کی کمزوری

بظاہر یہ بات بڑی مضبوط معلوم ہوتی ہے،مگر حقیقت میں اس سے زیادہ کمزوراور بودی بات نہیں ہوسکتی۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر چاند پر چاند کے ماحول اور حالات کے لحاظ سے ایک خاص طرح کی زندگی وجود میں آجانی چاہیے تھی۔ مریخ پر مریخ کے حالات کے لحاظ سے ایک طرح کی زندگی وجود میں آجانی چاہیے تھی۔ اسی طرح دیگر سیاروں کا بھی معاملہ ہے۔ مگر ہم جانتے ہیں کہ ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ انسان چاند پر جاچکا ہے۔ مریخ پر اس کی بنائی ہوئی مشینیں اتر چکی ہیں۔ جبکہ اس کے بنائے ہوئے خلائی جہاز پورے نظام شمسی کا سفر کرکے اس سے باہر نکل چکے ہیں۔ زندگی کہیں نہیں ملی۔ جبکہ اس اصول کے مطابق تو ہر جگہ زندگی کی کسی نہ کسی شکل کو ہونا چاہیے تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی کو بنانے اور باقی رہنے کے لیے ایک انتہائی خاص قسم کا ماحول چاہیے۔ اگر زندگی کی توجیہہ یہ کہہ کر کی جائے گی کہ یہ ماحول کی پیدا کردہ ہے تو اگلا سوال یہ پیدا ہوجائے گا کہ یہ ماحول کیسے وجود میں آ گیا؟ خود سائنسدان یہ تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی کو وجود میں لانے کے لیے کسی سیارے پر متعدد عوامل کا موجود ہونا ضروری ہے۔ ساٹھ کی دہائی میں مشہور ماہر فلکیات اور ملحد دانشور کارل ساگان نے ان کی تعداد دو بتائی تھی اور اب سائنسدان ان کی تعداد دوسو سے زائد بتاتے ہیں۔ جبکہ سائنسی دریافتوں کے ساتھ ان عوامل کی تعداد مزید بڑھے گی۔ یہ سارے عوامل ایک ساتھ کسی سیارے پر اتفاق سے جمع ہوجائیں ایسا ہونا خالص حسابی بنیادوں پر بھی بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ پھر مسئلہ صرف زندگی کے وجود میں آنے کا نہیں بلکہ کائنات کے

وجود میں آنے اور باقی رہنے کا ہے۔ یہ کائنات جن عناصر سے مل کر بنی ہے جو قوتیں اس میں کارفرما ہیں، وہ جب تک ایک خاص ترتیب میں نہ ہوں یہ کائنات نہ بن سکتی تھی نہ باقی رہ سکتی ہے۔

خدا کو ماننا ایک عقلی تقاضا ہے

ہم نے اپنی کتاب، قسم اُس وقت کی، میں مذہب مخالف تمام سوالات کو جمع کر کے ان کے جواب دیے ہیں۔ وہیں ہم نے ناول کی مرکزی کردار ناعمہ کے نام کی مثال دے کر یہ واضح کیا ہے کہ جو لوگ محض بخت و اتفاق کو ایسی بامعنی اور بامقصد چیزوں کے وجود میں آنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں وہ جان لیں کہ یہ حسابی طور پر ناممکن ہے۔ اندازہ کیجیے کہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ انگریزی زبان کے چھبیس حروف تہجی میں سے پانچ حروف پر مشتمل لفظ Naima وجود میں آئے، 78,93,600 منفرد الفاظ لکھنے ضروری ہیں۔ یہ اتفاق کو بنیاد بنا کر محض ایک لفظ لکھنے کا معاملہ ہے۔ دوسری طرف کائنات جیسی جگہ میں جہاں مختلف قسم اور تعداد کے سب اٹامک پارٹیکل، ایٹم، مالیکیول، عناصر اور ان سے مل کر وجود میں آنے والے لاتعداد عوامل پائے جاتے ہیں، وہاں زندگی کا وجود میں آنا اور اس کے لیے درکار دو سو سے زائد عوامل کا محض اتفاق سے جمع ہو جانا عملاً ناممکن ہے۔ کائنات میں کھربوں کو کھربوں سے ضرب دے کر جو عدد حاصل ہو، کائنات میں موجود سیاروں کی تعداد اگر اس سے بھی زیادہ ہو تب بھی اتنے زیادہ عوامل کا کہیں ایک ساتھ جمع ہو جانا اتفاق سے نہیں ہو سکتا۔

اس لیے ہم بہت اعتماد سے یہ کہتے ہیں کہ موجودہ دور میں سائنس نے کائنات اور زندگی سے متعلق جن حقائق کو کھول کر رکھ دیا ہے ان کے بعد ایک خالق کو ماننا کسی اندھے عقیدے کا

معاملہ نہیں بلکہ ایک لازمی عقلی تقاضا ہے۔ ہاں خدا کا انکار کرنا ایک اندھا عقیدہ ہے جو علم و عقل کے خلاف ہے۔

خدا کو ماننا کس طرح ایک عقلی تقاضا ہے اس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ملحدین بھی جب ارتقا کی روشنی میں زندگی کے تنوع اور پیچیدگی کو بیان کرتے ہیں تو قدم قدم پر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ نیچر نے فلاں موقع پر یہ کر دیا۔ اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی تخلیق یا اس کی زندگی سے موافقت کی توجیہ کرنے کے لیے اہل مذہب خدا کا نام لیتے ہیں، ملحدین ایسے سارے مواقع پر فطرت یا نیچر کا نام لے دیتے ہیں۔ ایسے میں صرف یہی عرض کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے خدا کا انکار نہیں کیا۔ اپنے خدا کا نام بدل کر نیچر رکھ دیا ہے۔ آپ اس خدا سے سارے کام خدا ہی کے لے رہے ہیں۔ بس اسے خدا ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

اس پر مستزاد یہ حقیقت ہے کہ آپ اس نظم کائنات کو طبعی یا حیاتیاتی قانون کا نتیجہ سمجھتے ہیں، تب بھی اگلے لمحے یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ ایسا بامعنی اور بامقصد قانون کس نے بنایا۔ آپ کہیں گے کہ کائنات نے 13.8 ارب سال کی مدت میں یہ قوانین خود ہی بنا لیے۔ ہم یہ عرض کریں گے کہ اب آپ نے خدا کا کام کائنات سے لیتے ہوئے اپنے خدا کا نام کائنات رکھ لیا۔ تاہم یہ جان لیجیے کہ آپ کا یہ خدا کسی بت سے بالکل مختلف نہیں۔ یہ بھی ایک بت کی طرح بے جان اور بے شعور مادہ ہے اور کچھ نہیں۔

ویسے قارئین کی معلومات کے لیے عرض ہے کہ یہ بھی ایک ہوائی بات ہے کہ کائنات نے اربوں برس میں خود ہی قوانین بنا لیے۔ سائنس نے اب یہ بتا دیا ہے کہ بگ بینگ کے پہلے لمحے کے اندر اندر ہی طبعی قوانین نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ یہ نہ ہوتا تو کائنات اپنی پیدائش کے

پہلے لمحے ہی میں ختم ہوجاتی۔سائنس کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کائنات میں چار بنیادی طاقتیں کارفرما ہیں۔قوت کشش، الیکٹرومیگنیٹک قوت، طاقتور نیوکلیائی قوت، کمزور نیوکلیائی قوت۔سائنس دان بتاتے ہیں کہ یہ قوتیں بگ بینگ کے پہلے سیکنڈ ہی میں فعال ہوگئی تھیں اور ان کی ویلیو یا مقدار اسی وقت طے ہوگئی تھی۔سوال یہ ہے کہ اتنے کم وقت میں کون سا ارتقا ہوسکتا ہے؟ یہ صرف اور صرف ایک بااختیار، طاقتور، علیم وحکیم ہستی کا کام ہے۔یہی خدا ہے۔یہی خدا ہے۔

مذہب پر کیے جانے والے اعتراضات کی حقیقت

اس کے بعد اگلی چیز مذہب پر کیے جانے والے دو اعتراضات ہیں۔یعنی مذہب عقل کے خلاف ہے اور یہ کہ اس کے پیروکاروں میں عدم برداشت اور نفرت پائی جاتی ہے۔اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں مذہب کے نام پر دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ایک خدا کا نازل کردہ مذہب جو صرف اور صرف قرآن مجید اور سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں پایا جاتا ہے۔دوسرا وہ مذہب جو دنیا کے تمام مذہبی گروہ بشمول مسلمان اختیار کیے ہوئے ہیں۔یہی وہ دوسرا مذہب ہے جو ہمیشہ دنیا کے سامنے آتا ہے۔ہم تفہیم مدعا کے لیے پہلے مذہب کو الہامی مذہب اور دوسرے کو انسانی مذہب کہہ لیتے ہیں۔بدقسمتی سے ملحدین جو اعتراض کرتے ہیں وہ اس انسانی مذہب کے بارے میں بالکل درست ہے۔انسانی فکر کی آمیزشوں اور انحرافات کے ساتھ مذہب میں ہمیشہ یہ مسائل پیدا ہوجاتے ہیں۔

تاہم الہامی مذہب جو دین اسلام ہے۔اپنی اصل تعلیم کے لحاظ سے ایک بالکل مختلف جگہ پر کھڑا ہے۔قرآن اپنے نہ ماننے والوں کے درمیان نازل ہوتا تھا۔اس کے پاس اپنی بات

منوانے کا ایک ہی راستہ تھا۔ وہ یہ کہ اپنی بات کو دلائل سے ثابت کیا جائے۔ چنانچہ قرآن کی پوری دعوت نہ صرف عقلی دلائل پر کھڑی ہے بلکہ وہ بار بار یہ کہتا ہے کہ حقیقت اگر اسلام کے دعووں کے برعکس ہے تو اسے سامنے لایا جائے۔ اگر کوئی دلیل ہے تو پیش کی جائے۔ اگر سچائی کچھ مختلف ہے تو قرآن پیغمبر اسلام سے کہلواتا ہے کہ میں سب سے پہلے اسے قبول کروں گا۔ اس سے بڑھ کر معقولیت کا رویہ اور عقلی استدلال کو قبول کرنے کی روش اور کیا ہو گی؟

جہاں تک رواداری اور عدم برداشت کا معاملہ ہے تو اس میں قرآن مجید نے ایک بے مثال اصول دے دیا ہے۔ لا اکراہ فی الدین۔ یعنی دین میں کوئی جبر نہیں۔ مذہب بندے اور خدا کا معاملہ ہے۔ لوگوں کو ماننا ہے تو مانیں اور نہیں ماننا تو نہ مانیں۔ خدا کا کام حق پہنچانا اور سمجھانا ہے۔ یہ دنیا امتحان کے لیے بنائی گئی ہے۔ یہاں مکمل آزادی ہے۔ لوگوں کا دل چاہے تو دین حق کو مانیں اور نہ چاہے تو نہ مانیں۔ اللہ نے اس بنیاد پر کوئی سزا و جزا اس دنیا میں برپا نہیں کرنی۔

ہاں ایک روز آئے گا جب اللہ تعالیٰ غیب کا پردہ اٹھا کر خود سامنے آ جائیں گے۔ اس روز کوئی شخص خدا کا انکار نہیں کر سکے گا۔ اس روز ہر شخص سے پوچھا جائے گا کہ آزادی اور نعمتیں پا کر سرکش ہوئے یا بندگی اور نیکی کی راہ پر چلے۔ جو لوگ سرکش ہوئے اور حق کو جھٹلاتے رہے وہ اپنے انجام کو پہنچیں گے۔ رہے بندگی اور نیکی کی راہ پر چلنے والے تو یہ کائنات ہمیشہ کے لیے ان کے تصرف میں دے دی جائے گی۔

اصل مسئلہ یہ نہیں کہ سچائی اور اس کے دلائل یہاں موجود نہیں۔ اصل مسئلہ وہ انسانی مذاہب ہیں جو خدا کے نام پر کھڑے ہو کر لوگوں کو غیر عقلی باتیں بتاتے اور نفرت اور عدم برداشت کا سبق دیتے ہیں۔ الہامی مذہب عقلی بھی ہے اور آزادی کا علمبردار بھی ہے۔ یہی اسلام ہے جو تا قیامت انسانیت کے لیے کافی رہنما ہے۔

مولانا وحید الدین خان

شرک کی بے ثباتی

شرک کیا ہے؟ شرک یہ ہے کہ انسان، اللہ کے سوا کسی اور کو معبود بنائے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب بھی کوئی انسان، اللہ کے سوا کسی اور کو اپنا معبود بناتا ہے، تو وہ اپنے لیے نہایت برے بدل کا انتخاب کرتا ہے: یعنی یہ کتنا زیادہ برا بدل ہے ظالموں کے لیے (الکھف 18 :50)۔

یہ آیت گویا کہ پوری تاریخ پر ایک تبصرہ ہے۔ انسان نے بار بار ایسا کیا ہے کہ اس نے خدا کے سوا، کسی اور کو اپنے لیے معبود کا درجہ دیا۔ لیکن ہر بار یہ ثابت ہوا کہ انسان کا انتخاب نہایت برا انتخاب تھا۔ ایک اللہ کے سوا، کسی کا بھی یہ درجہ نہیں کہ اس کو اپنا معبود بنایا جائے۔

قدیم زمانے میں ہزاروں سال تک انسان، نیچر کو معبود کا درجہ دیتا رہا۔ چنانچہ دنیا میں عمومی طور پر ہر وہ نظام پرستش رائج ہوا جس کو فطرت پرستی کہا جاتا ہے۔ سورج، چاند، پہاڑ، دریا، سمندر اور دوسری چیزوں کے بارے میں انسان نے یہ فرض کرلیا کہ ان کے اندر الوہیت موجود ہے۔ اس مفروضہ کی بنا پر، نیچر کی ہر چیز انسان کے لیے قابل پرستش بن گئی۔

جدید سائنس کے زمانے میں نیچر کی ہر چیز کو تحقیق کا موضوع بنایا گیا، ہر چیز کا آزادانہ مطالعہ کیا جانے لگا۔ اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ نیچر صرف نیچر ہے، اس میں کسی بھی قسم کی الوہیت (divinity) موجود نہیں۔ اس دریافت کے بعد فطرت پرستی کا افسانہ ختم ہوگیا۔ نیچر نے معبود ہونے کی حیثیت کو کھودیا۔

اس کے بعد موجودہ زمانے میں صنعتی تہذیب کا دور شروع ہوا۔ اس جدید تہذیب سے انسان کو بہت سی ایسی چیزیں ملیں، جو اس کو پہلے نہیں ملی تھیں۔ جدید تہذیب کی اس کامیابی نے بہت سے لوگوں کو فریب میں مبتلا کردیا۔ وہ سمجھنے لگے کہ جدید صنعتی تہذیب، ان کے لیے معبود کا بدل (substitute) ہے۔ جدید تہذیب سے لوگوں کو وہی تعلق قائم ہوگیا جو معبود حقیقی کے

ساتھ ہونا چاہیے۔ لیکن جلد ہی معلوم ہوا کہ انسانی صنعت کا ایک بہت بڑا منفی پہلو ہے، وہ یہ کہ انسانی صنعت صرف تہذیب کو وجود میں نہیں لاتی، بلکہ وہ اسی کے ساتھ صنعتی کثافت بھی پیدا کرتی ہے۔

اکیسویں صدی عیسوی میں یہ صنعتی کثافت اپنی اس حد کو پہنچ گئی جس کو گلوبل وارمنگ کہا جاتا ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ جدید صنعت ہمارے لیے جو دنیا بنا رہی ہے، وہ ایک پر کثافت دنیا ہے، یعنی ایک ایسی دنیا جہاں انسان جیسی کسی مخلوق کے لیے رہنا ہی ممکن نہیں۔

انسان یہ سمجھتا تھا کہ صنعتی تہذیب اس کے لیے اسی دنیا کو جنت بنا دے گی، مگر معلوم ہوا کہ صنعتی تہذیب جو دنیا بنا رہی ہے، وہ اپنی آخری حد پر پہنچ کر انسان کے لیے ایک صنعتی جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس طرح، صنعتی تہذیب کا مفروضہ معبود بھی ایک باطل معبود ثابت ہوا۔

اب انسان نے ایک اور معبود تلاش کیا۔ یہ معبود انسان کی خود اپنی ذات، یا سلف ہے۔ یہ سمجھ لیا گیا کہ خود انسان کے اندر وہ سب کچھ موجود ہے جس کو وہ اپنے باہر تلاش کر رہا ہے۔ اس ذہن کے تحت، یہ فرض کر لیا گیا کہ انسانی وجود کا صرف ایک منفی پہلو ہے، اور وہ موت ہے۔ لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ جدید میڈیکل سائنس یہ مسئلہ حل کر دے گی اور انسان ابدی طور پر اس دنیا میں جینے کے قابل ہو جائے گا۔ مگر میڈیکل سائنس بے شمار تحقیقات کے باوجود اس معاملے میں ناکام ہو گئی، جدید میڈیکل سائنس، انسان کو ابدی زندگی کا فارمولا نہ دے سکی۔ چنانچہ یہ نظریہ معبودیت بھی بے بنیاد ثابت ہو کر ختم ہو گیا۔

اب انسانی علم اس مقام پر پہنچا ہے، جہاں اس کے لیے صرف ایک انتخاب باقی رہ گیا ہے، اور وہ یہ کہ وہ حقیقت پسند بنے اور اللہ واحد کو اپنا معبود تسلیم کر کے اس کے آگے جھک جائے۔ اسی حقیقت پسندانہ اعتراف میں انسان کی دنیوی کامیابی کا راز بھی ہے اور اسی میں اس کی آخروی کامیابی کا راز بھی ہے۔

مولانا محمد ذکوان ندوی

کتابِ مہجور

قرآن کو چھوڑنے اور اُس سے غفلت واعراض کرنے والے آخرت میں جب اپنی بدبختی پر ماتم کررہے ہوں گے، اُس وقت خود اللہ کا رسول اُن کے اِس جرم کی گواہی دیتے ہوئے خدا کے سامنے اُن کی ایک شکایت درج فرمائے گا، اور وہ ہے ـــــــ اُن کا قرآن مجید کو 'کتابِ مہجور' بنا دینا۔ اِس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے: 'وَ قَالَ الرَّسُوْلُ یٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوْا ھٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا' (الفرقان ۲۵:۳۰) یعنی رسول کہے گا کہ پروردگار، میری قوم کے اِن لوگوں نے قرآن جیسی اِس عظیم کتاب کو بالکل نظر انداز کر دیا تھا۔

اِس آیت میں 'مہجور' کا لفظ استعمال ہوا ہے، جو 'ھَجَرَ' سے مشتق ہے۔ اِس کا مطلب ہے: چھوڑنا اور بالکل نظر انداز کر دینا۔ 'ھَجْر' یا 'ھِجْران' عربی زبان میں کسی چیز سے خصوصی ربط وتعلق کے باوجود اُس کو ترک کر دینے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے: 'ھو ترکُ شيءٍ مع وجود ارتباطٍ بينهما' (التحقيق في كلمات القرآن، حسن المصطفوي: ۱۱/۲۶۲)۔

مفسر ابن کثیر (وفات: ۷۷۴ ہجری) نے آیۂ زیر بحث کی تشریح کے تحت اِس 'ھِجْران' کے مختلف پہلوؤں کی وضاحت درج ذیل الفاظ میں فرمائی ہے: 'وتركُ الإيمان به وترك تصديقه من هِجْرانه، وترك تدبّره وتفهّمه من هجرانه، وترك العمل به وامتثال أوامره واجتناب زواجره من هجرانه، والعدولُ عنه إلى غيره من شعرٍ أو قولٍ أو غناءٍ أو لهوٍ أو كلامٍ أو طريقةٍ مأخوذةٍ من غيره، من هجرانه' (تفسیر ابن کثیر: ۳/۳۲۹) یعنی قرآن پر ایمان نہ لانا، عملاً اُسے سچا نہ جاننا، اُسے سمجھنے اور اُس پر غور وفکر کرنے کی کوشش نہ کرنا، اُس کی تعلیمات پر عمل نہ کرنا، اُس کے احکام بجا نہ لانا، اُس کے منع کردہ کاموں سے نہ رکنا۔ البتہ اُس کے سوا، بے معنی

شاعری، اقوال وملفوظات، گانا بجانا اورلہو ولعب جیسی دوسری چیزوں میں منہمک رہنا، نیز اُن چیزوں اوراُن علوم میں دل چسپی لینا جوقرآن سے ماخوذ ومستفاد نہ ہوں،جنھیں قرآن کی تصدیق حاصل نہ ہو۔۔۔۔۔۔ یہی وہ روش ہے جسے یہاں قرآن کوکتابِ مہجور بنادینے سےتعبیر کیا گیا ہے۔

غورکرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اِس 'ہجران' سے مرادقرآن کو بظاہر مان کرحقیقتاً اُس کو نہ ماننا ہے، یعنی قرآن کے مومن ہونے کا دعویٰ کرنے کے باوجود تذکیر وتلاوت کے اعتبار سے عملاً قرآن کواپنی زندگی سے نکال دینا، اُس کوکتابِ مقدس سمجھنے کے باوجود اُس کوکتابِ ہدایت نہ سمجھنا، اصولِ دین میں اُس کی حاکمیت کوتسلیم نہ کرنا، اُسے 'میزان' و'فرقان'، معیارِحق وباطل اور رہنماوقائد کے مقام سے ہٹا کرمعروف معنوں میں محض ایک پراسرارکتاب اورایک مقدس گرنتھ بنادینا۔

قرآن مجید سے غفلت واعراض کے مختلف پہلو ہیں۔ اِس ہجران کے بعض مظاہر کا تذکرہ کرتے ہوئے آٹھویں صدی ہجری کے مشہور عالم ابن قیم الجوزیہ (وفات: ۷۵۱ہجری) تحریر فرماتے ہیں:

☆ هَـجْـرُ سـمـاعـه، والإيمان به، والإصغاء إليه. (قرآن مجید کو سننے، اُس پر ایمان لانے اوراُس کی طرف متوجہ ہونے کوترک کردینا۔)

☆ هـجر العمل به، والوقوف عند حلاله وحرامه وإن قرأه وآمن به. (قرآن مجید پرنہ عمل کرنا، اُس کے حلال وحرام کا اتباع نہ کرنا، خواہ بظاہر آدمی قرآن مجید کو پڑھنے اوراُس پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرے۔)

☆ هـجر تحكيمه والتحاكم إليه في أصول الدِّين وفروعه، واعتقاد أنه لا يفيد

اليقين، وأنّ أدلّته لفظيةٌ لا تحصل العلم .(اصولِ دین اور اُس کے فروعات کے معاملے میں قرآن مجید کو حاکم نہ بنانا اور عملاً اُس کے فیصلے کو نہ ماننا۔ اِسی طرح یہ سمجھنا کہ 'اصولی' معاملات میں قرآن مجید سے یقین کا فائدہ حاصل نہیں ہوتا، نیز یہ کہ قرآن مجید کے دلائل لفظی ہیں اور اِس طرح کے لفظی دلائل سے قطعی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔)

☆ هجر تدبره وتفهمه، ومعرفة ما أراد المتكلم به منه.(قرآن مجید کو سمجھنا اور نہ اُس پر غور وفکر کرنا، نیز اُس کی آیات میں بیان کردہ اللہ کی اصل منشا ومراد کی معرفت اور اُس کا علم حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔)

☆ هجر الاستشفاء والتداوي به في جميع أمراض القلوب وأدوائها، فيطلب شفاء دائه من غيره، ويهجر التداوي به —— وكلٌّ هذا داخل في قوله تعالى: 'وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوا هَذَا الۡقُرۡآنَ مَهۡجُورًا' ۔(اِسی طرح، تمام قلبی امراض (غفلت وقساوت اور بخل ونفاق، وغیرہ) میں قرآن مجید سے شفا وعلاج حاصل کرنے کے بجائے اُس کے علاوہ چیزوں میں شفا کا یقین رکھنا اور قرآن مجید کے بتائے ہوئے نسخۂ شفا کو ترک کردینا —— یہ تمام چیزیں اِس ارشادِ الٰہی کی وعید میں شامل ہیں: 'وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ إِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوا هَذَا الۡقُرۡآنَ مَهۡجُورًا' (الفرقان ۲۵:۳۰)۔(الفوائد، ابن القیم الجوزیۃ: ۸۲/۱)

حقیقت یہ ہے کہ گذشتہ 'مسلمانوں' (یہود ونصاریٰ) کا جرم بھی یہی تھا اور موجودہ مسلمانوں کا جرم بھی یہی ہے۔ انھوں نے بھی عملاً کتاب اللہ کو چھوڑ دیا تھا، اور موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے بھی کتاب اللہ کے معاملے میں یہی طریقہ اختیار کررکھا ہے، یعنی قرآن ایک قومی کتاب ہونے کے باوجود عملاً اُن کے نزدیک اپنی اصل حیثیت (کتابِ ہدایت) کے اعتبار سے باقی نہیں رہا۔

مولانا ذکوان ندوی

مسلمان اور قرآن

غلام احمد اپرویز (وفات: ۱۹۸۵ء) ایک مشہور مصنف اور مفکر تھے۔ تصورِ دین اور اصولِ فہم قرآن سے متعلق راقم اُن کے آرا وافکار سے اصولاً اتفاق نہیں رکھتا* تاہم دوسرے اہل علم کی طرح اُن کی بعض چیزیں یقیناً فکر انگیز ہیں۔ اِسے 'خُذْ ما صفا، و دَعْ ما کَدَر' کے اصول پر 'الحِکمةُ ضالّة المؤمن' کے تحت بلاتعصب ہمیں اخذ کرنا چاہیے۔ اُنھی میں سے ایک بات وہ ہے جسے یہاں اپنی ڈائری سے نقل کیا جارہا ہے:

''قرآن کریم میں ہے: 'وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا'، ''اور رسول، خدا کے حضور میں کہے گا کہ اے میرے پروردگار! میری قوم نے اِس قرآن کریم کو 'مَهْجُوْر' بنادیا تھا'' (الفرقان ۲۵:۳۰)۔ اِس آیت کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو چھوڑ دیا تھا۔ لیکن 'مَهْجُوْر' کے معنی اِس سے کہیں زیادہ گہرے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو گائے، بھینس یا گھوڑا دوڑ کر بھاگ جاتا ہو، اُس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ہیں اور رسی کا دوسرا سرا اُس کی سینگ کے ساتھ یا گلے میں باندھ دیتے ہیں، لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے۔ اُسے اِس طرح جکڑ دیا جاتا ہے کہ وہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اِسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔ اِس طرح بندھے ہوئے جانور کو 'مَهْجُوْر' کہا جاتا تھا۔ 'الهِجَار' (تاج العروس، مرتضیٰ الزَبیدي: ۷/۶۱۰) اُس رسی کو کہتے تھے جس سے اُنھیں اِس طرح جکڑ دیا جاتا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خود

ساختہ اعتقادات، خیالات، رسومات، روایات، قوانین، تفاسیر، وغیرہ کی رسیوں سے جکڑ کر 'مَهُجُور' بنا رکھا تھا جس کی بنا پر وہ ایک قدم بھی آزادی کے ساتھ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اُنھوں نے قرآن کریم کو چھوڑا نہیں تھا، بلکہ سینوں سے لگا رکھا تھا؛ لیکن اُس کی ساری آزادیاں سلب کر رکھی تھیں اور اُسے اتنا ہی چلنے کی اجازت دی جاتی تھی، جتنی اُن کے خود ساختہ ''مذہب و شریعت'' کی رسی مناسب سمجھتی تھی، یعنی یہ قرآن کے تابع نہیں تھے، بلکہ قرآن کریم اُن کے تابع تھا—— یہ ہے مطلب قرآن کریم کو 'مَهُجُور' بنا دینے کا'' (لغات القرآن، غلام احمد پرویز، صفحہ ۱۷۵۴)۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، قرآن کی مذکورہ آیت (الفرقان ۲۵: ۳۰) میں 'مَهُجُور' کے لفظ کا اصل مادہ 'هجر' ہے۔ تاہم یہ ایک واقعہ ہے کہ صدرِ اوّل کے بعد عملاً ہماری 'مذہبی' تاریخ میں قرآن کو کبھی آزادانہ حکم رانی کا 'اِذن' حاصل نہیں رہا۔ 'اصولیین' کے 'اصول و قواعد' کی خوب صورت لگام اور خود ساختہ اعتقادات کا طوق (هجار) ہمیشہ قرآن کی گردن میں ڈالنے کی کوشش کی گئی۔ یہ اِسی طرزِ فکر کا نتیجہ تھا کہ ہمارے 'مذہبی' لٹریچر میں 'الرسالۃ' (شافعی: ۲۰۴ ہجری) سے 'الموافقات' (شاطبی: ۷۹۰ ہجری) تک کلیات، عقلیات، اِجماع، اِستقرا اور اصولِ فقہ جیسے انسانی مفروضات تو قطعی الدلالت قرار پائے، مگر قرآن جیسا محکم ربانی کلام آج تک ظنی الدلالت بنا ہوا ہے۔ یہ اِسی 'ربیائی مذہبیت' (rabbinic religiosity) کا پیدا کردہ فساد ہے کہ آج ہم اللہ اور رسول کے سوا، دوسرے اصول و معتقدات اور فلسفہ و افکار کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈال کر 'ذلت و مسکنت' کی ایک عبرت ناک علامت بن کر رہ گئے ہیں۔

آصف محمود

کیا ہم ایک ابنارمل زندگی گزار رہے ہیں؟

نہ کوئی اچھا ڈرامہ بن رہا ہے نہ کوئی اچھی فلم، نہ کوئی اعلیٰ درجے کا اداکار سامنے آ رہا ہے نہ ادیب، نہ کوئی شاہکار افسانہ لکھا جا رہا ہے نہ شعر، نہ کوئی بڑا گلوکار باقی بچا ہے نہ فنکار۔ نہ کہیں شعروادب کی بات ہو رہی ہے نہ فنون لطیفہ کی۔ نہ کوئی علمی محفل باقی بچی ہے نہ فکری نشست۔ پورے ملک کے پاس ایک ہی موضوع ہے اور وہ ہے سیاست۔ شادی کی تقریب ہو یا جنازہ اٹھایا جا رہا ہو اہل وطن سیاست کی گتھیاں سلجھاتے پائے جاتے ہیں۔ سیاست ہی ان کا مزاح ہے، سیاست ہی فنون لطیفہ، یہی ڈرامہ ہے، یہی آرٹ، اسی سے کتھارسس ہوتا ہے اسی سے صف بندی ہوتی ہے۔ اس ملک میں اگر سماج کسی کا موضوع ہوتا اور سماجیات پر تحقیق ہوا کرتی تو کوئی بتاتا ہم کتنے بڑے عارضے سے دوچار ہو چکے ہیں۔ اس اودھم کو دیکھتا ہوں تو کبھی خیال آتا ہے کیا ہم ایک ابنارمل زندگی گزار رہے ہیں؟

ایک معاشرے کے مختلف رنگ ہوتے ہیں، ذوق کے بھی اور شوق کے بھی۔ معاشرے میں تنوع ہوتا ہے۔ معاشرے میں ایک روانی ہوتی ہے۔ معاشرہ تمام اکائیوں کو ایک ساتھ لے کر آگے بڑھنے کا نام ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے کو دیکھیں تو یوں لگتا ہے ہم نے سارے شعبے اور سارے کام ملتوی کر کے ایک طرف رکھ دیے ہیں اور ہم بال بچوں سمیت سیاست میں غرق ہو چکے ہیں۔ سیاست کے علاوہ ہمارے پاس نہ کوئی موضوع ہے نہ کوئی سرگرمی۔ کیا ایک صحت مند اور نارمل معاشرہ ایسا ہوتا ہے؟

معاشرے کی ایک افتادِ طبع ہوتی ہے۔ کوئی شاعری کی طرف مائل ہے، کوئی سیاحت کی

جانب، کسی کو پہاڑ بلا رہے ہوتے ہیں تو کوئی صحرا کے سحرے کہہ رہا ہوتا ہے، کوئی حسن فطرت میں ڈوبا ہوتا ہے تو کوئی حسن یار میں۔ کہیں کھیلوں کے میدان آباد ہوتے ہیں تو کہیں شعر و ادب کی دنیا آباد ہوتی ہے۔ کوئی فلم ڈراما بن رہا ہوتا ہے تو کہیں کوئی علمی اور فکری تخلیق ہو رہی ہوتی ہے۔ کہیں ٹیکنالوجی کی نئی دنیا آباد ہو رہی ہوتی ہے تو کہیں تحقیق نئی منازل طے کر رہی ہوتی ہے۔ معاشرے میں ان تمام سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ان پر بحث بھی ہو رہی ہوتی ہے۔ لیکن پاکستان میں یوں لگتا ہے باقی سب کچھ منجمد ہو چکا ہے اور صرف سیاست ہو رہی ہے چنانچہ ہر طرف بحث بھی صرف سیاست پر ہی ہوتی ہے۔ دفاتر میں سیاست، گھروں میں سیاست، شادی بیاہ کی تقاریب میں سیاست، جنازے پر سیاست، بدحواسی کا ایسا آسیب اترا پڑا ہے کہ کسی کے پاس سیاست کے علاوہ بات کرنے کا کوئی موضوع نہیں رہا۔

اخبارات اٹھا کر دیکھیں تو صفحہ اول پر بھی سیاست اور صفحہ آخر پر بھی سیاست، کالموں کا موضوع بھی سیاست، تجزیوں کا میدان بھی سیاست۔ ٹی وی آن کریں تو خبر بھی سیاست، ٹاک شو بھی سیاست، تجزیہ کاری بھی سیاست اور دانشوری بھی سیاست۔ سوال وہی ہے: کیا ہمارے پاس اور کوئی موضوع نہیں؟ یہ ہم نے اپنے معاشرے کے ساتھ کر کیا دیا ہے۔ فنون لطیفہ اجنبی بن چکے اور حس لطیف ختم ہو گئی۔ اب جنون ہے وحشت ہے اور سیاست۔ انسانی طبیعت کے جتنے تقاضے ہیں ہم نے بھلا دیے۔ اس خلاء کو سیاست اور سیاست دانوں نے بھر دیا ہے۔ فلم اور ڈرامے ختم ہو گئے، اب اہل سیاست کے ٹاک شوز اور ان کی چالاکیاں گویا معاشرے کے لیے فنون لطیفہ ہیں۔ یہی ہیرو ہیں، یہی ولن، لوگ انہیں دیکھتے ہیں، ہنستے ہیں، لطف اندوز ہوتے ہیں، ان پر مزاحیہ پوسٹس ہوتی ہیں، میمز بنائی جاتی ہیں۔ مزاح سے طنز تک جتنی بھی تخلیق ہو رہی

ہے اس کا عنوان سیاست ہے۔

ذوق لطیف سے لے کر زندگی کے جبر تک جتنے بھی موضوعات تھے، اجنبی ہو چکے۔ اہل علم اور صاحب فن اجنبی ہوتے جا رہے ہیں۔ اب کالم نگار اور اینکر پرسن ہی بقلم خود دانشور ہے اور وہ دنیا کے ہر موضوع پر قوم کی رہنمائی کرنے کو ہر وقت دستیاب ہے۔ حتیٰ کہ کہیں دورے پر جائے یا کسی کی دعوت پر، میزبان کی مدح اور اپنا احوال یوں بیان کرتا ہے گویا اسے گمان ہو یہ سب لکھا نہ گیا تو آنے والی نسلیں علمی سرمائے سے محروم رہ جائیں گی۔ خوفناک سطحیت نے معاشرے کو لپیٹ میں لے لیا ہے۔ ابلاغ کی دنیا میں سر شام ٹاک شوز کی محافل سجتی ہیں، موضوعات کا چناؤ پست فکری کا نوحہ کہہ رہا ہوتا ہے۔ مکالمے کا کلچر تباہ ہو چکا ہے۔ دلیل اور شائستگی کی جگہ شعلہ بیانی نے لے لی ہے۔ سرخرو ہونے کا پیمانہ اب دلیل اور شعور نہیں زبان ہے۔ جس کی کاٹ زیادہ ہے، میدان اسی کے نام ہے۔

جس سیاست نے ہمارے موضوعات کو چاٹ کھایا، جس سیاست کے لیے لوگ دست و گریبان ہوئے پڑے ہیں اور جس سیاست کے لیے دوستیاں ہی نہیں لوگوں نے خونی رشتے بھی داؤ پر لگا دیے ہیں، کبھی آپ نے سوچا کہ اس سیاست میں ایک عام آدمی کا کردار ہی کتنا ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے اور اس کی کل اوقات کتنی ہے؟ ایک عام آدمی کے لیے پارلیمان کے سارے راستے بند ہیں۔ انتخابی کھیل اتنا مہنگا ہے کہ اس کی دسترس سے دور ہے۔ گماشتے اور کارندے تو حق بجانب ہیں جو اس امید پر پارٹیوں کی ڈور سے بندھے ہوتے ہیں اور انوسٹمنٹ کرتے ہیں کہ اقتدار آئے تو وہ اس بندر بانٹ میں سے سود سمیت حصہ وصول کریں۔ لیکن ایک عام آدمی

کے لیے اس سارے کھیل میں کیا رکھا ہے؟ وہ اپنے سماجی تعلقات اور رشتے کس لیے داؤ پر لگائے بیٹھا ہے؟

ابھی خبر چل رہی ہے کہ مسجد نبوی میں جن لوگوں نے سیاسی نعرے بازی کی تھی انہیں سعودی عرب میں سزا سنا دی گئی ہے۔ کسی کو دس سال قید تو کسی کو آٹھ سال قید۔ ہمارے لیے اب سوچنے کا مقام یہ ہے کہ اس سیاست میں ہم اس حد تک کیوں چلے گئے کہ نہ ادب رہا نہ حیا رہی؟ یہ کیسی وحشت ہے جو اس سیاست نے ہمارے وجودوں میں بھر دی ہے۔ یہ لوگ یہاں سے محنت مزدوری کرنے گئے تھے۔ سیاسی جہنم نے ان کی دنیا اجاڑ دی۔ آخرت کا معاملہ خدا جانتا ہے، دلوں کے حال بھی وہی جانتا ہے، وہ رحیم بھی ہے اور کریم بھی، خدا سب پر رحم فرمائے، لیکن ان سزا یافتہ لوگوں نے اپنے سے جڑے اپنے خاندانوں کے کتنے ہی خواب اجاڑ دیے؟ کس لیے؟

کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم چیزوں کی ترتیب درست کریں، ان میں توازن اور اعتدال لائیں اور یہ بات جان لیں کہ زندگی محض سیاست کا نام نہیں۔ اس کے اور بھی بہت سے اجزائے ترکیبی ہیں۔ زندگی شعر و ادب بھی ہے، زندگی ابر و کہسار بھی ہے، زندگی جینے اور مر مر کے جینے کی کوہ کنی کا نام بھی ہے، زندگی ناتمام حسرتوں کا آزار بھی ہے، زندگی سرشاری بھی ہے اور حزن بھی۔ زندگی مروت اور وضع داری بھی ہے اور زندگی شرم و حیا بھی ہے۔ زندگی ان تمام سے بے نیاز ہو کر صرف سیاست کا ہو کر رہنے کا نام نہیں ہے۔

[بشکریہ: روزنامہ 92 نیوز]

صائمہ جواد

سکون اور خدا کا دین

سکون اس دنیا میں ہر انسان کا مسئلہ ہے۔ اس سکون کا ایک پہلو مادی ہے جس میں انسان اپنے وجود کو ہر دکھ، بیماری اور پریشانی سے دور کر کے مادی خوشیوں اور راحت کا سامان پیدا کرتا ہے۔ مگر اس کے بعد بھی انسان کی فطرت ایک روحانی سکون کی تلاش میں رہتی ہے۔ یہ سکون اللہ کے دین میں ہے۔ جب انسان اصل دین کو سمجھ لیتا ہے اور اس کی spirit بھی اس پر واضح ہو جاتی ہے، دین کی حقیقت کھل جاتی ہے اور شریعت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے ہر چیز اپنی جگہ بیٹھ جاتی ہے تو ایک سکون آپ کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ کیونکہ اس کے بعد جو چیز دین میں اہم ہے اسی کو اہم بنا کر عمل کیا جاتا ہے۔ ایسا انسان جب کسی عمل کو اس کی روح کے مطابق اختیار کرتا ہے تو اس کی روح سکون و اطمینان سے بھر جاتی ہے۔ مثلاً جب کوئی شخص قربانی کی روح کو سمجھ لیتا ہے کہ یہ خود کو اللہ کے لیے قربان کر دینے کی تمثیل ہے اور قربانی میں انسان خود کو رب کے حضور نذر کرتا ہے تو اسے قربانی کر کے حقیقی خوشی کا احساس ہوتا ہے۔ دین کے حوالے سے صحیح تصورات واضح ہوتے ہیں تو ایسا لگتا ہے ہر چیز اپنی جگہ آ ہو گئی ہو، جیسے کسی بکھرے ہوئے کمرے کو سمیٹ لیا جائے اور ہر چیز اپنی جگہ رکھ لی جائے ایسے ہی ہماری زندگی بھی ترتیب میں آ جاتی ہے۔ اصل دین کو سمجھنے کے بعد زندگی سے غیر ضروری ٹینشن ختم ہو جاتی ہے کیونکہ ہم غیر اہم چیزوں کو اہمیت دے کر خود اپنے لیے ٹینشن پیدا کرتے ہیں۔ اس کے بعد عبادات بوجھ نہیں لگتیں بلکہ اپنی ہمت کے مطابق دل سے ادا ہوتی ہیں کہ یہ سمجھ میں آ گیا ہے کہ دین کا اصل مقصد تزکیہ ہے۔ آیئے ہم سب اس روشنی سے بھرپور فائدہ اٹھا کر خود کو بھی نکھاریں اور آگے اس خیر کی روشنی کو پھیلانے والے بن جائیں ان شاء اللہ۔

ڈاکٹر ریحان احمد یوسفی (ابو یحییٰ)

برصغیر اور دعوت دین کا طریقہ کار (5)

احیائے اسلام کی فکر کا ظہور

برصغیر میں احیائے اسلام، حکومت الٰہیہ جیسے تصورات گرچہ مولانا آزاد نے الہلال اور البلاغ کے ذریعے سے متعارف کروائے لیکن ان کو ایک فکر کے قالب میں ڈھال کر اور قرآن و حدیث کے دلائل سے مستنبط کر کے اس فکر کو ایک دعوت کی صورت میں پیش کر کے اور اس تصور کی بنیاد پر ایک جماعت کو قائم کر کے اس فکر کے غلبے کی کوشش کرنے والی شخصیت مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی کی تھی۔

مولانا مودودی ایک عالم اور مفکر ہی نہیں تھے بلکہ قدرت نے ان کو وہ قلم بھی عطا کیا تھا جس کی روانی سے ہر پڑھنے والا متاثر ہوتا تھا۔ آزاد کی طرح انھوں نے صحافت کو اپنے خیالات کے فروغ کا ذریعہ بنایا اور اپنے ماہنامے ترجمان القرآن کے ذریعے سے قبل از تقسیم کے ہندوستان بھر میں اپنے خیالات پھیلا دیے۔ اس کے ساتھ انھوں نے جماعت اسلامی کے نام سے ایک جماعت بھی قائم کی جس کا مقصد حکومت الٰہیہ کے قیام کی جدوجہد کرنا تھا۔

مولانا نے فکری اور عملی ہر دو پہلو سے دین اسلام، اس کی شرح و وضاحت، اس پر اعتراضات کے جواب اور دور حاضر میں دین کے احیا کو اپنا موضوع بنایا۔ اپنے رسالے ترجمان القرآن اور اپنی تصانیف کے ذریعے سے انھوں نے احیائے اسلام کی سوچ کو زندہ کیا۔ لوگوں میں یہ شعور پیدا کیا کہ اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جو زندگی کے ہر گوشے پر اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ انھوں نے اس بات کو دوٹوک انداز میں نمایاں کیا کہ اسلام فرد ہی نہیں بلکہ اجتماعیت کے ہر گوشے میں بھی اصول و قوانین دیتا ہے اور اس پس منظر میں غلبہ دین کے لیے جدوجہد کرنا ہر مسلمان کا بنیادی فرض ہے۔

مولانا مودودی کی یہ تعبیر دین آنے والوں برسوں میں تقلید اور تنقید دونوں کا موضوع بنی۔ تاہم ہماری اس تحقیق کے پس منظر میں اس فکر کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے دعوت دین کے طریق کار کے ضمن میں وہ اساس مہیا کردی جس کی بنیاد پر دعوت دین کے طریق کار پر مبنی وہ لٹریچر وجود میں آیا جو علوم اسلامیہ میں ایک نئی شاخ یعنی دعوت دین کے قانون کے وجود میں آنے کا باعث بنا۔

مولانا مودودی کی ابتدائی زندگی اور تعلیم وتربیت

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی 25 ستمبر 1903 ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ آپ مولانا احمد حسن کے تین صاحبزادوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ وہ اپنے جد اعلیٰ خواجہ سید قطب الدین مودود چشتی جو کہ چشتیہ سلسلے کے بزرگ تھے، ان کے نام پر مودودی کہلائے۔ ننھیال کی طرف سے آپ کے بزرگوں کا آبائی وطن ترکی تھا۔ آپ کے نانا مرزا قربان علی بیگ خان سالک دہلی کے معروف شاعر اور مرزا غالب کے دوست تھے۔ آپ کی دادی سر سید احمد خان کے خاندان سے تھیں۔

مولانا مودودی نے ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی۔ والد صاحب نے متعدد فنون کے اساتذہ کی خدمات حاصل کی تھیں تاکہ آپ کا یہ بیٹا عالم بن سکے۔ ان اساتذہ سے آپ نے عربی فارسی، منطق، فقہ اور حدیث کی تعلیم حاصل کی۔ گیارہ برس کی عمر میں آپ کو مدرسہ فوقانیہ مشرقیہ کی جماعت رشیدیہ میں داخل کرادیا گیا۔ یہ مدرسہ شبلی نعمانی کے ان افکار کے تحت قائم ہوا تھا جن میں روایتی مذہبی تعلیم کے ساتھ جدید علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ یہاں سید مودودی کو جدید علوم سے آشنا ہونے کا موقع بھی ملا۔ 1917 ء میں آپ نے مولوی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ 1918ء میں آپ کو مولوی عالم کی سند کے لیے ریاست حیدرآباد کے دارالعلوم میں داخل کرایا گیا جس کے پرنسپل مولانا حمید الدین فراہی جیسے بڑے عالم دین تھے۔ تاہم تکمیل سے قبل

ہی آپ دہلی منتقل ہو گئے۔ یہاں بھی جدید و قدیم علوم خاص کر مغربی فکر و فلسفہ کا مطالعہ جاری رکھا۔

1920ء میں مولانا مودودی نے صحافت کے شعبے سے منسلک ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھا اور ہفت روزہ تاج میں بحیثیت ایڈیٹر ملازمت کا آغاز کیا۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ علوم اسلامیہ کا مطالعہ جاری رکھا۔ اور اس عرصے میں درس نظامی، عربی ادب، منطق و کلام جیسے علوم میں دسترس پیدا کی۔ مولانا کے پاس علوم دینیہ کی متعدد سندیں تھیں جن میں پہلی آپ کے اولین مدرسے یعنی مدرسہ فوقانیہ اورنگ آباد سے ملنے والی مولوی کی سند تھی۔ اس کے علاوہ اپنے قیام دہلی کے دوران میں آپ نے ذاتی کوششوں سے مطالعہ کر کے تین اسناد فراغت علمائے دین و مدرسین سے حاصل کیں۔ پہلی 1926ء میں مولانا محمد شریف اللہ خان مدرس دارالعلوم فتح پوری دہلی سے ملنے والی سند ہے جو علوم عقلیہ و ادبیہ و بلاغت اور علوم اصلیہ وفروعیہ کی ہے۔ جبکہ 1927ء اور 1928ء میں مدرسہ عالیہ عربیہ فتح پوری دہلی کے مولانا اشفاق الرحمٰن کاندھلوی سے ملنے والی سند فراغت میں جن علوم کا ذکر ہے ان میں حدیث، فقہ، ادب اور سنن ترمذی اور موطا امام مالک کی سمع و قرأت کی تکمیل شامل ہے۔

عملی صحافت اور تصنیف و تالیف کا آغاز

مولانا مودودی ایک عالم دین تھے، لیکن انھوں نے عملی زندگی میں آنے کے لیے درس و تدریس یا تعلیم و تربیت کے بجائے صحافت کو اپنا میدان بنایا اور قلم کی اس طاقت کو استعمال کرنے لگے جس کا وافر عطیہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو عطا ہوا تھا۔

جیسا کہ پیچھے بیان ہوا ہے کہ مولانا نے ہفت روزہ تاج سے اپنی صحافتی زندگی کا باقاعدہ آغاز کیا۔ یہ جبل پور کے رہنے والے ایک صاحب تاج الدین کا ہفت روزہ تھا۔ تاج الدین صاحب انجمن نظر بندانِ اسلام کے روح رواں تھے۔ مولانا مودودی نے اس سفر کا آغاز اپنے بھائی

ابوالخیر مودودی کے ساتھ کیا۔ مگر اس دور میں حکومتی دباؤ کی وجہ سے اخبارات پر سخت پابندیاں عائد تھیں۔ چنانچہ چند ماہ بعد ہی یہ ہفت روزہ بند ہوگیا۔ تاج الدین صاحب نے دوبارہ اس کا آغاز کیا اور اس دفعہ تنہا اس کی ذمہ داری مولانا مودودی پر تھی۔ کچھ عرصہ بعد یہ ہفت روزہ روزنامے میں تبدیل ہوگیا اور مولانا مودودی تنہا اس کو چلاتے رہے۔

اس دوران میں مولانا کے ایک مضمون پر حکومت کی طرف سے گرفت ہوئی۔ مگر چونکہ اخبار کے پبلشر، پرنٹر اور ایڈیٹر کے طور پر تاج الدین صاحب کا نام شائع ہوتا تھا اس لیے مولانا براہ راست کسی حکومتی گرفت سے بچ گئے۔ لیکن اس کے بعد 1920ء کے خاتمے پر مولانا واپس دہلی آ گئے۔

1921ء کے ابتدائی دور میں ان کی ملاقات مفتی کفایت اللہ اور مولانا سعید احمد ناظم وصدر جمعیت علمائے ہند سے ہوئی۔ ان بزرگوں نے جمعیت علمائے ہند کی طرف سے ایک ہفت روزہ اخبار مسلم کے نام سے نکالا اور مولانا مودودی کو اس کا ایڈیٹر مقرر کر دیا۔ یہ اخبار 1923ء تک جاری رہا اور مولانا آخری وقت تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اس کے بعد مولانا نے جمعیت علمائے ہند کے سہ روزہ اخبار ''الجمیعہ'' کی ادارت سنبھالی۔ یہ اخبار 1925ء میں دہلی سے جاری ہوا۔ مولانا 1928ء تک اس کے مدیر رہے۔ 1920ء کی اس دہائی میں مولانا مودودی نے صحافت کے میدان میں اپنے آپ کو منوالیا۔ اس دوران میں مولانا نے تصنیفات کا آغاز بھی کر دیا تھا۔ آپ کی پہلی معروف تصنیف اخلاقیات اجتماعیہ ماہوار رسالے ہمایوں میں سن 1924ء میں شائع ہونے والا ایک قسط وار مضمون تھا جو دس اقساط میں مکمل ہوا۔

آپ کی دوسری اہم تصنیف ''اسلام کا سرچشمہ قوت'' نامی ایک مضمون تھا جو الجمیعہ کے جولائی اور اگست 1925ء کے شماروں میں اداریوں کی شکل میں شائع ہوا تھا۔ اس کی کتابی شکل میں

اشاعت 1969ء میں ہوئی۔

وجہ شہرت: الجہاد فی الاسلام

مولانا مودودی کی وہ تصنیف جس نے انھیں قبل از تقسیم کے ہندوستان میں شہرت عطا کی وہ ان کی کتاب الجہاد فی الاسلام ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کا پس منظر یہ ہے کہ ہندو مذہب کے سیاسی اور سماجی احیا کی تحریک شدھی کے سرپرست سوامی شردھانند نے ہندو دھرم سے اسلام اور مسیحیت اختیار کرنے والوں کو دوبارہ بالجبر ہندو بنانے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ اس تنازعے کا شاخسانہ تھا کہ 23 دسمبر 1926ء کے دن ایک مسلمان عبدالرشید نے دہلی میں واقع سوامی شردھانند کے گھر میں داخل ہو کر ان کو قتل کر دیا۔ اس صورت حال پر اسلام کے خلاف ایک زبردست پروپیگنڈا شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ خود مہاتما گاندھی نے یہ کہا کہ اسلام ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوا ہے جس کی فیصلہ کن طاقت پہلے بھی تلوار تھی اور آج بھی تلوار ہے۔ اس موقع پر مولانا محمد علی جوہر نے جامع مسجد دہلی میں تقریر کرتے ہوئے اس خواہش کا اظہار کیا کہ کاش کوئی بندہ خدا اس وقت اسلامی جہاد پر ایسی کوئی کتاب لکھے جو مخالفین کے سارے اعتراضات اور الزامات کو رفع کر کے جہاد کی اصل حقیقت دنیا پر واضح کر دے۔

اس کتاب کی تصنیف کے وقت مولانا مودودی کی عمر صرف 23 برس تھی۔ وہ اس زمانے میں الجمعیہ کے ایڈیٹر تھے۔ ابتدا میں مولانا مودودی کے پیش نظر صرف ایک مختصر مضمون لکھنا تھا، مگر سلسلہ کلام پھیلتا گیا اور پھر الجمعیہ میں تقریباً 24-23 مضامین لکھنے کے بعد انھوں نے اخبار میں اس کی اشاعت بند کی اور ایک تفصیلی کتاب کی شکل میں اس کو مرتب کر کے پیش کیا۔ یہ کتاب پہلی دفعہ دار المصنفین سے 1930ء میں شائع ہوئی۔

[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

خراجِ تحسین ان حسین آنکھوں کے نام

خالقِ دو جہاں!
شکر ہے یہ تیرا
تو نے آنکھوں کو دی
روشنی کی قبا
سامنے ہے میرے ایک چہرا حسیں
اس کی آنکھیں جو ہیں
صرف آنکھیں نہیں
آئینہ ہیں ترا
جن کے ذریعے سے وہ
وسعتوں کو تیری
دیکھتا ہے، زمانے کو دکھلاتا ہے
تیری خوشبو کے رنگوں کو مہکاتا ہے
خالقِ دو جہاں!
آنکھیں قدرت کا تیری حسیں شاہکار
ان کو بینائی دے کر کیا بے مثال

تیری تخلیق کے اس حسیں رنگ کو زنگ کھائے نہیں
آئینوں پہ تیرے دھند آئے نہیں
روز روشن کی مانند آنکھیں حسیں
جگمگاتی رہیں
مسکراتی رہیں
کہ یہ آنکھیں جو ہیں صرف آنکھیں نہیں
آئینہ ہیں تیرا
جن کے ذریعے سے وہ
تیرے عکسِ جلی کو زمانے کو دکھلاتا ہے
تیری خوشبو کے رنگوں کو مہکاتا ہے
دیکھتا ہے زمانے کو دکھلاتا ہے
اور سارے زمانے سے منواتا ہے
ان کو شفافیت کی قبا کر عطا
ان کو دیدۂ بینا سے تو جگمگا

آمین

ابو یحییٰ کے ناول

جو آپ کی سوچ، زندگی اور عمل کا محور بدل دیں گے

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ایک منکرِ خدا لڑکی کی داستان سفر، جو سچ کی تلاش میں نکلی تھی

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

خدا بول رہا ہے

عظمتِ قرآن کا بیان ایک دلچسپ داستان کی شکل میں

Please visit this link to read the articles and books of Abu Yahya online for free.

www.inzaar.org

To get Abu Yahya Quotes Join us on twitter:

Twitter ID: @AbuYahya_inzaar

To read Abu Yahya articles regularly Join us on Facebook

Abu Yahya Page: www.facebook.com/abuyahya.inzaar

Abu Yahya Account: www.facebook.com/abuyahya.jzsh

Join us on Youtube

Search inzaar on YouTube to see our audios and lectures

To get monthly books, CDs/USB and Inzaar's monthly magazines at home anywhere in Paksitan, contact # 0332-3051201 or 0345-8206011

To participate in online courses, visit

www.inzaar.org/online-courses/

To get any other information, email to globalinzaar1@gmail.com

Following material in audio form is available on USB/CD:

Quran Course by Abu Yahya

Quran Translation and Summary by Abu Yahya

Islahi Articles

Jab Zindagi Shuru Hogi (book)

Qasam Us Waqt Ki (book)

Aakhri Jang (book)

ماہنامہ
اِنذار

فون: 0332-3051201
ای میل: globalinzaar@gmail.com
web: www.inzaar.org

ایک دعوتی واصلاحی رسالہ ہے۔اس کا مقصد لوگوں میں ایمان واخلاق کی دعوت کو عام کرنا ہے۔ اس دعوت کو دوسروں تک پھیلانے میں ہمارا ساتھ دیجیے۔ یہ رسالہ خود بھی پڑھیے اور دوسروں کو بھی پڑھوائیے۔اپنے کسی عزیز، دوست، ساتھی یا رشتہ دار کے نام سال بھر رسالہ جاری کروانے کیلئے:

فی کاپی سالانہ سبسکرپشن چارجز: (بذریعہ رجسٹری) صرف 1000 روپے

ایجنسی ڈسکاؤنٹ 20 فیصد ہے۔ ایجنسی ڈسکاؤنٹ کے لیے کم از کم ہر ماہ پانچ رسالے لینا ضروری ہے۔

سبسکرپشن چارجز مندرجہ ذیل پر ارسال کریں	
Easy Paisa	Muhammad Shafiq 0334-3799503 CNIC # 42201-8355292-9
Money Order	Monthly Inzaar 4th Floor Snowhite Centre Abdullah Haroon Road Opp. Hotel Jabees Saddar Karachi
Account	Title of Account: Monthly Inzaar A/C # 0171-1003-729378 Bank Al Falah Saddar Branch Karachi.

آپ سے درخواست ہے کہ سبسکرپشن چارجز بھیجنے کے بعد اپنے نام اور موبائل نمبر کے ساتھ نیچے دیے ہوئے نمبر پر کال یا SMS ضرور کریں تا کہ آپ کے رسالے کی سبسکرپشن کی جا سکے۔مزید معلومات کے لیے ان نمبرز پر رابطہ کریں۔شکریہ

0332-3051201

اگر آپ ہماری دعوت سے متفق ہیں تو ہمارے ساتھ تعاون کر سکتے ہیں، اس طرح کہ آپ:

1) ہمارے لیے دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے

2) 'ماہنامہ انذار' کو پڑھیے اور دوسروں کو پڑھوائیے

3) تعمیرِ ملت کے اس کام کو دوسروں تک پہنچانے کے لیے رسالے کی ایجنسی لیجیے

Monthly
INZAAR

SEP 2022
Vol. 10, No. 09
Regd. No. MC-1380

Publisher: Rehan Ahmed Printers: The Sami Sons Printers,

25-Ibrahim Mansion, Mill Street, Pakistan Chowk, Karachi